اُردو (لازمی)

برائے

انٹرمیڈیٹ سال دوم

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اُردو (لازمی)

بارھویں جماعت کے لئے

پبلشرز

نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ

برائے

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
	حصہ نثر		
۱	بنتِ بہادر شاہ	خواجہ حسن نظامی	۶
۲	ریل کا سفر	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۵
۳	زمانہ قدیم میں ہندوستانیوں کے طور طریقے	مولانا محمد حسین آزاد	۲۳
۴	مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم	مولانا شبلی نعمانی	۳۰
۵	اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ	مہدی افادی	۳۸
۶	کہنے کی باتیں	مولانا صلاح الدین احمد	۴۶
	افسانے		
۱	سفارش	احمد ندیم قاسمی	۵۲
۲	جی آیا صاحب	سعادت حسن منٹو	۶۰
۳	کتبہ	غلام عباس	۷۰
۴	چور	اشفاق احمد	۸۱
۵	شریف آدمی	شوکت صدیقی	۸۹
۶	نیا گوتم	الطاف فاطمہ	۱۰۵
	طنز و مزاح		
۱	سویرے جو کل آنکھ میری کھلی	پروفیسر پطرس بخاری	۱۱۳
۲	سنہ	مشتاق احمد یوسفی	۱۲۳
	شخصیت نگاری		
۱	آغا حشر	چراغ حسن حسرت	۱۳۱
۲	ایک وصیت کی تعمیل	فرحت اللہ بیگ	۱۴۲

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۳	تیسری قسم کا بچہ	فارغ بخاری	۱۵۴
	غزلیات		
۱	؎ کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد	علامہ محمد اقبال	۱۵۹
۲	؎ وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے۔۔۔	فیض احمد فیض	۱۶۴
۳	؎ دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی	ناصر کاظمی	۱۶۸
۴	؎ تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے	احمد فراز	۱۷۴
۵	؎ کوئی امکاں نہیں تجھ تک رسائی کا	احمد ندیم قاسمی	۱۷۶
۶	؎ یہ سوچ کر کہ تیری جبیں پہ نہ بل پڑے	شہزاد احمد	۱۸۰
۷	؎ بکھری ہوئی فلک پہ فلک شام ہے کوئی	ظفر اقبال	۱۸۴
۸	؎ آ کے پتھر تو میرے صحن میں دو چار گرے	شکیب جلالی	۱۸۸
	حصہ نظم		
۱	فاطمہ بنت عبداللہ	علامہ محمد اقبال	۱۹۱
۲	او دیس سے آنے والے بتا!	اختر شیرانی	۱۹۶
۳	وحدتِ انسانی	جوش ملیح آبادی	۲۰۰
۴	دکھ کی کروٹ	میراجی	۲۰۵
۵	طلوعِ فرض	مجید امجد	۲۱۰
۶	پہلی کرن	ن۔م۔راشد	۲۱۵
۷	زندگی	منیف نیازی	۲۲۰
۸	دھرتی کی آواز	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۲۴
۹	فرہنگ		۲۲۷

سب کو پریشانیوں سے نجات دے"۔

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا، زینب کو پیار کیا اور میرے خاوند مرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نورمحل صاحبہ کو ہمراہ کر دیا جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعے سے نکلا۔ جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیائالدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں، دوسری نواب نورمحل، تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہم نے اپنے بھرے پُرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو اُمنڈ نے لگے۔ نواب نورمحل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور صبح کے ستارے کا جھلملانا نورمحل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باجرے کی روٹی اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی۔ اس وقت بھوک میں یہ چیزیں بریانی تنجن سے زیادہ مزے دار معلوم ہوئیں۔ ایک دن تو امن سے بسر ہوا مگر دوسرے دن گردونواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر لوٹنے کو چڑھ آئے۔ سیکڑوں عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جو چڑیلوں کی طرح ہم لوگوں کو چمٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے ان لوگوں نے اتار لیے۔ جس وقت یہ سڑی سی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں تو ان کے لہنگوں سے ایسی بو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو کافی ہو سکتا ہے۔ حیران تھے کہ دیکھیے اب اور کیا پیش آئے گا؟ زینب پیاس کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک زمیندار نکلا۔ میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ "بھائی تھوڑا سا پانی اس بچی کو لا دے"۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا "آج سے تو میری بہن اور میں تیرا بھائی"۔

یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کا نام بستی تھا۔ اس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں۔ ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی، شاہی حکیم رہتے ہیں، جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں، وہاں لے چل، بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا، مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جس کی کوئی حد نہیں۔ صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لیے کہ میں تم لوگوں کو ٹھہرا کر اپنا گھر بار تباہ نہیں کرنا چاہتا۔

وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہوگی، اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً پورا کیا جائے، وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نبھایا اور ہمارا

ساتھ نہ چھوڑا، ناچار اجاڑے سے روانہ ہوکر حیدرآباد کا رخ کیا۔ عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے۔ تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں کوئل کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے جو سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اُتارا۔ ابھی ہم ندی کے پار اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہوکر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جائیے۔ ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے۔ سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا ہم لوگ وہاں سے نکل بھاگے پر ہائے! کیسی مصیبت تھی کہ ہم کو بھاگنا بھی نہیں آتا تھا۔ گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے۔ سر کی چادریں وہیں رہ گئیں۔ برہنہ سر، حواس باختہ، ہزار دِقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خونم خون ہوگئے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں، زینب پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہم کو سنبھالتے تھے، مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہوگئیں۔ میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں؟ کہیں سہارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہوگئی لیکن فقیروں کو چین واطمینان ہوتا ہے، یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ بستی، ندی سے پانی لایا ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا۔ نور محل رونے لگیں اور بولیں۔ ابھی خواب میں تمھارے بابا حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق وزنجیر پہنے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”آج ہم غریبوں کے لیے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرش مخمل سے بڑھ کر ہے۔ نور محل! گھبرانا نہیں ہمت سے کام لینا۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں۔ ذرا میری کلثوم کو دکھا دو۔ جیل خانے جانے سے پہلے اُسے دیکھوں گا“۔

بادشاہ کی یہ باتیں سن کر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی۔ ”کلثوم! کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا“۔ مرزا عمر سلطان نے اس کا جواب دیا کہ خواب و خیال ہے۔ بادشاہ لوگ، بادشاہوں کے ساتھ بدسلوکیاں نہیں کیا کرتے۔ تم گھبراؤ نہیں وہ اچھے حال میں ہوں گے۔ حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن بولیں۔ ”یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے۔ خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آنے کو بیچتے ہیں (سکے کی طرف اشارہ ہے جس میں بادشاہ کے سر کی مورت ہوتی ہے) بوا نور محل! تم نے تو طوق وزنجیر پہنے دیکھا ہے میں کہتی ہوں کہ بنیئے بقالوں سے تو اس سے بھی زیادہ بدسلوکی دور نہیں۔ مگر میرے شوہر مرزا ضیاء الدین نے تسکین دلاسے کی باتیں کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اتنے میں بستی، ناؤ میں گاڑی کو اس پار

یاد نے بے چین کیا اور روانہ ہوکر دہلی آگئے۔ یہاں انگریزوں کی سرکار نے بہت بڑا ترس کھا کر دس روپیہ ماہوار پینشن مقرر کردی۔ اس پینشن کی رقم کو سن کر اول تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لے کر دس روپے معاوضہ دیتے ہیں مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو اللہ کا ہے۔ کسی کے باوا کا نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

(غدر دہلی کے افسانے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے بچوں کو خود سے کیوں الگ کیا؟

ب) کورالی گاؤں میں شاہی قافلے کو کھانے میں کیا میسر آیا؟

ج) لال قلعہ سے روانگی کے بعد بنت بہادر شاہ کہاں گئیں؟

د) کس نے کلثوم زمانی بیگم سے کہا کہ آج سے تو میری بہن اور میں تمہارا بھائی۔''

ہ) کلثوم کا خاوند کس چیز کا ماہر تھا؟

و) بنت بہادر شاہ کا مکہ معظمہ میں بڑے سلطان سے کون مراد تھا؟

ز) مرزا ضیاء الدین اور مرزا عمر سلطان کس کی فوج میں شامل ہونا چاہتے تھے؟

ح) مکہ معظمہ میں شہزادی نے کس کے ہاں قیام کیا؟

۲۔ سبق کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) بنتِ بہادر شاہ کا نام تھا۔

i) زینب زمانی بیگم
ii) قمر زمانی بیگم
iii) کلثوم زمانی بیگم
iv) نواب نور محل

ب) مکہ معظمہ میں بنتِ بہادر شاہ نے قیام کیا۔

i) تین برس
ii) سات برس
iii) نو برس
iv) گیارہ برس

ج) انگریز سرکار نے ماہوار پنشن مقرر کی۔

i) دس روپیہ ii) بارہ روپیہ

iii) پندرہ روپیہ iv) اٹھارہ روپیہ

د) ہجرت کے وقت زینب کی عمر تھی۔

i) ساڑھے تین برس ii) ڈھائی برس

iii) تین برس iv) دس برس

ہ) اُجاڑہ ضلع میں واقع ہے۔

i) میرٹھ ii) دہلی

iii) حیدرآباد iv) کلکتہ

و) بادشاہ کو خواب میں دیکھا۔

i) بنت بہادر شاہ نے ii) نور محل نے

iii) مرزا ضیاء الدین نے iv) مرزا عمر سلطان نے

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) بنت بہادر شاہ کے قافلے میں تین مرد اور تین عورتیں تھیں۔

ب) میر فیض علی نے بنت بہادر شاہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

ج) بنت بہادر شاہ ظفر نے بغداد اور نجف میں ایک ایک سال قیام کیا۔

د) بنت بہادر شاہ اپنے والد کو حضرت ظل سبحانی کہتی تھیں۔

ہ) قافلہ لال قلعے سے شام کے وقت روانہ ہوا۔

۴) متن کے مطابق خالی جگہ میں درست لفظ تحریر کریں۔

الف) نور محل بادشاہ کی .... تھیں۔

ب) کلثوم بیگم کے خاوند کا نام .... تھا۔

ج) مرزا عمر سلطان بادشاہ .... تھے۔

د) بادشاہ کے سمدھن کا نام .... تھا۔

ہ) یہ .... کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔

ریل کا سفر

(ڈاکٹر وزیر آغا)

مقاصدِ تدریس

۱۔ آپ بیتی لکھنے کی مشق کرانا۔
۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے طرزِ نگارش سے واقفیت دلانا۔
۳۔ ادب پارے کے مرکزی خیال اور خلاصہ لکھنے سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ کو سماجی یک جہتی اور یگانگت کی اہمیت بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

ہوائی اُڑانا ۔ بھانت بھانت ۔ بادی النظر ۔ اقامت پذیر ۔ استہزائیہ ۔ مریل ۔ نووارد ۔ گڈمڈ ۔ یکہ وتنہا ۔ ریوڑ ۔ بوالعجمیوں

ریل میں سفر کرنے کے یوں تو بہت سے فائدے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس سفر کی ترغیب دلانے والے اکثر و بیش تر جسمانی آسائش کے حصول پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتے ہیں جو پوری سیٹ پر دراز، سر کے نیچے تکیہ اور پاؤں کے نیچے تہہ کیا ہوا بستر رکھے ایک شانِ دلربائی کے ساتھ کتاب پڑھنے میں منہمک ہوتا ہے۔ آخر میں یہ لوگ اُس شخص کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں آسائش کا اس سے زیادہ لطیف اور پاکیزہ تصور ناممکن ہے۔

بادی النظر میں تو مجھے اس شخص کا قول قابلِ قبول ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے یاد آتا ہے کہ ریل میں سفر کرتے وقت اول تو ساری سیٹ پر دراز ہونے کی سعادت ہی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اور اگر نصیب ہو بھی جائے تو چلتی گاڑی میں کتاب پڑھنا اس سے مشکل تر مسئلہ بن جاتا ہے۔ میں بہ مشکل اپنی انگلی کی مدد سے آدھی سطر پڑھنے میں کامیابی حاصل کرتا ہوں کہ ریل کے ایک ہی ہچکولے سے میری انگلی کسی اور سطر پر جا ٹکتی ہے۔ کچھ وقت اصل سطر کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ خرابی بسیار مجھے اس سطر تک رسائی حاصل ہوتی ہے تو ریل کا تازہ جھٹکا انگلی کو پھر کسی دوسری سطر تک پہنچا دیتا ہے۔ کتاب تو در کنار مجھے کبھی چلتی ریل میں پانی کا گلاس پینے میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ویسے کوشش میں نے کئی بار کی ہے اور دوسرے مسافروں کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے باوجود کنگ بروس اور کڑی کی روایات کو برقرار رکھتا آیا ہوں۔ لیکن بد قسمتی سے گلاس اور ہونٹ میں کبھی ملاپ نہیں ہو سکا۔ تصادم البتہ کئی بار ہوا ہے۔

جسمانی آسائش سے قطع نظر ریل کے سفر کے بعض دوسرے پہلو یقیناً بڑے جاذبِ نظر اور خیال انگیز ہیں اور میں دراصل انھی پہلوؤں کے پیشِ نظر ریل کے سفر کی پرزور سفارش کرنے لگا ہوں۔ ان میں سے ایک پہلو تو یہ ہے کہ ریل کا سفر

انسانی فطرت کے نفسیاتی مطالعہ کے بعض نہایت قیمتی مواقع فراہم کرتا ہے۔ جب تک ہم اپنے گھر، محلّہ، شہر یا گاؤں میں اقامت پذیر رہتے ہیں ہماری بہت سی جبلتوں پر رسم و رواج اور روایت و اخلاق کے بھاری پردے پڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ہم اپنے اس زندان سے نکل کر ریل میں سوار ہوجاتے ہیں اور گھر، محلّہ، شہر یا گاؤں کے ساتھ ہمارے روابط کچھ مدّت کے لیے ٹوٹ جاتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمارے فطری اوصاف یا برائیاں اُبھر کر نمایاں ہوجاتی ہیں۔ چناں چہ میں نے اکثر اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ ریل کے سفر کے دوران میں یا تو لوگ حد سے زیادہ ملنسار اور بامروت نظر آتے ہیں اور یا حد سے زیادہ چڑ چڑے اور بدمزاج دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح فطری طور پر خاموش لوگ ریل کے ڈبے میں اس درجہ خاموش ہوجاتے ہیں کہ ان پر رحم آنے لگتا ہے۔ اور فطرتاً باتونی لوگ کچھ اتنے باتونی ہوجاتے ہیں کہ جان چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ مجھے یوں تو ریل کے سفر میں انسانی فطرت کے اس دلچسپ مطالعہ کے بہت سے مواقع ملے ہیں۔ لیکن ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پچھلے موسمِ سرما کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا اور میں لاہور جانے کے لیے ایک غیر معروف اسٹیشن سے انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہوا تھا۔ اتفاق سے ڈبے میں ایک سیٹ خالی تھی اور میں جلدی سے بستر بچھا اس پر دراز ہوگیا اور دراز ہوتے ہی سوگیا۔ نہ جانے میں کتنی مدّت سویا رہا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی منوں بھاری چیز میری ٹانگوں پر آگری ہے۔ میں نے جلدی سے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو ایک صاحب نظر آئے جو میری سیٹ کے آخری کونے میں بڑے اطمینان سے براجمان ہوچکے تھے۔ خیر میں دوبارہ سوگیا لیکن چند ہی لمحوں کے بعد محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھے آہستہ آہستہ اوپر کو دھکیل رہی ہے۔ اس بار میں نے منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہی صاحب اب آدھی سیٹ پر قبضہ کرچکے تھے اور بتدریج اپنی مملکت کی حدود کو بڑھا رہے تھے۔ اب میرے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں کچھ اور سمٹ جاتا۔ چناں چہ میں کچھ اور سمٹ گیا۔ وہ کچھ اور پھیل گئے۔ میں اٹھ بیٹھا۔ وہ لیٹ گئے اور بڑی بے تکلفی سے خراٹے لینے لگے۔ اب اتفاق دیکھیے کہ میرے سامنے والی سیٹ پر دوسرے مسافروں کے علاوہ ایک انتہائی مریل قسم کے صاحب تشریف فرما تھے اور قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ سارا ڈراما انتہائی غور سے ملاحظہ فرمایا ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اُن کے چہرے سے استہزائیہ تبسم کی بجائے خشونت مترشح تھی۔ جیسے وہ میرے بزدلانہ فعل کو انتہائی حقارت سے دیکھ رہے ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُس وقت مجھے اپنی نالائقی پر اس قدر شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے اپنی گردن جُھکا لی اور اُن سے آنکھیں چار کرتے ہوئے ڈرنے لگا۔ لیکن شاید کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کہ اگلے ہی اسٹیشن پر جو گاڑی رُکی تو ایک انتہائی بھاری بھرکم صاحب ہانپتے کانپتے گاڑی میں سوار ہوئے اور مسافروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ان مریل صاحب کے پہلو میں تشریف فرما ہوگئے۔ ان صاحب نے انتہائی حقارت اور غصے سے نووارد کی اس حرکت کو دیکھا اور کچھ دیر تک ماتھے پر تیوری ڈالے انہیں بڑی سختی سے گھورتے رہے۔ اس کارروائی کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انہوں نے اپنا شانہ نووارد کے پہلو سے لگا دیا اور پورے جوش اور ولولے کے ساتھ اُنہیں سیٹ پر

سے دھکیلنے کی سعی کا آغاز کردیا۔ خاصی دیر تک وہ بڑے زور وشور سے یہ کام سرانجام دیتے رہے۔ لیکن وہ بھاری بھرکم صاحب کچھ کھانے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انہیں اس زور آزمائی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بہرحال کچھ مدت تک تو حملہ یک طرفہ تھا اور پھر اچانک ان بھاری بھرکم صاحب کو اپنے ساتھی مسافر کی حرکت کا علم ہوگیا۔ وہ مسکرائے اور ذرا سا پہلو بدل ڈالا۔ لیکن ان کی اس انتہائی بے ضرر حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مریل صاحب سیٹ سے دوگز پرے اُچھل کر دوسرے مسافروں پر جاگرے۔ تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اور دوبارہ اپنی کارروائی کا آغاز کردیا۔ باقی راستہ یہ ڈراما برابر جاری رہا۔ یہ زور لگاتے رہے، وہ مسکراتے اور پہلو بدلتے رہے اور میں جاگتا رہا۔

لیکن فطرت انسانی کی بوالعجمیوں کا یہ مطالعہ ہی مجھے ریل کے سفر کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ اُن پراسرار مناظر میں کھو جانے کے لیے بھی ریل میں سوار ہوتا ہوں، جو ریل کی کھڑکی سے باہر حد نظر تک پھیلے ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ریل کا سفر بہ یک وقت مجھے انبوہ اور تنہائی کا احساس دلاتا ہے یعنی جب میں اپنے ساتھی مسافروں کو دیکھتا ہوں جنہیں تقدیر نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اٹھا کر چند لمحوں کے لیے ایک جگہ گڈمڈ کردیا ہے اور جو بھانت بھانت کی بولیوں انوکھے متضاد خیالات اور بدمزاجی اور مروت کے مظاہروں سے چہکتی بولتی زندگی کا ایک انتہائی سچا نمونہ پیش کرتے ہیں، تو میں خود بھی اس کلبلاتی ہوئی مخلوق کا ایک جزو بن جاتا ہوں۔ اور ایسی سنجیدگی سے اپنی آرا کو دلائل سے مضبوط کرتا ہوں گویا فریق مخالف کا اقرار ہی میری زندگی کا اہم ترین مشن ہے لیکن میں جب دوسرے ہی لمحے ریل کی کھڑکی سے ایک نظر باہر کی دُنیا پر ڈالتا ہوں تو نہ صرف یہ کہ اپنے ساتھی مسافروں کی موجودگی سے بے نیاز ہوجاتا ہوں، بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس وسیع وعریض کائنات میں یکہ وتنہا کھڑا ہوں۔ ایسے میں میرے ساتھی مسافروں کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکراتی تو ہیں لیکن اس طور گویا کسی گہرے کنویں سے آرہی ہوں۔ اور میری تمام تر توجہ اُس ہر آن بدلتے ہوئے منظر پر مرکوز ہوجاتی ہے جو مجھے تیزی سے حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ میں اس منظر کے اجزائے ترکیبی پر غور کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ بظاہر تو محض چند نہروں، کھیتوں اور پہاڑیوں سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مجموعی تاثر کس درجہ حسین و دلفریب ہے اور تب ایمرسن کی طرح مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ اس منظر کا ہر جزو کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔ یعنی نہر سرکار کی ہے، کھیت زید کا ہے، مکان بکر کا ہے۔ لیکن یہ منظر۔ سارے کا سارا منظر میرا اور صرف میرا ہے۔ نیلے آسمان پر قرمزی ابر پارے بکھرے ہوئے ہیں اور میرے ساتھ ساتھ دوڑتے جارہے ہیں۔ حد نظر تک کھیتوں اور پہاڑیوں کا دل فریب سلسلہ ہے جو بھنور کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ شام ہونے کو آئی ہے۔ گاڑی ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزر رہی ہے۔ گاؤں میں زندگی کی رفتار کس قدر سُست ہے۔ ایک جوان لڑکی پانی کا گھڑا اٹھائے ہوئے ہولے ہولے رہٹ کی طرف آرہی ہے۔ کوئی گڈریا دھیرے دھیرے اپنے ریوڑ کو لیے گاؤں میں داخل ہورہا ہے۔ گاؤں کے تنور سے گاڑھا گاڑھا سُست رو دھواں اُٹھ رہا ہے اور گاڑی فراٹے بھرتی ہر شے کو پیچھے چھوڑتی، کسی نامعلوم منزل کی جانب

اُڑی چلی جارہی ہے۔ آپ ہی کہیے کوئی ایسے منظر کو کیسے فراموش کرسکتا ہے؟ یہ منظر تو دل میں رکھ لینے کے قابل ہے اور میں ایسا ہی کرتا ہوں۔

لیکن ریل کا سفر محض اڑتے ہوئے مناظر سے حظ اٹھانے تک ہی محدود نہیں اس کا ایک دلچسپ پہلو اُن اسٹیشنوں کی زندگی سے لطف اندوز ہونا بھی ہے جو حرکت اور تموج کے سمندر میں ننھے ننھے خاموش جزیروں کی طرح نظر آتے ہیں اور جن کے کناروں پر ریل گاڑی لحظہ بھر کے لیے رُکتی ہے۔ لیکن شاید میں نے ان جزیروں کو خاموش قرار دینے میں غلطی کی ہے۔ کیوں کہ اُڑتے ہوئے مناظر کی خاموشی کے مقابلے میں یہاں زندگی کی گھما گھمی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے بڑے اسٹیشنوں کی بات نہیں کرتا۔ جہاں ریڑھی والے آپ کی کھڑکی کے عین نیچے آکر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ ہانک لگاتے ہیں۔ تا کہ آپ پر اشیا خریدنے کے لیے نفسیاتی دباؤ ڈال سکیں۔ اور جہاں انجنوں کی شفٹنگ، قلیوں کی بھاگ دوڑ اور بدحواس مسافروں کی گھبراہٹ پر آپ کو میدانِ کارزار کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ اُن ننھے ننھے یتیم اسٹیشنوں کی بات کرتا ہوں جہاں اسٹیشن ماسٹر صاحب وردی کے کوٹ کے نیچے لٹھے کی شلوار پہنے ہاتھ میں کاغذات کا پلندہ لیے، گارڈ کے ڈبے کی طرف بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اور کانٹے والا باآوازِ بلند انجن ڈرائیور سے چلم کے لیے آگ کا مطالبہ کررہا ہوتا ہے اور جہاں آپ کو اچانک محسوس ہوتا ہے گویا ایک طویل تنہائی کے بعد آپ نے زندہ و شاداب، تڑپتی اور مسکراتی ہوئی زندگی کا پرتو دیکھا ہے۔ اسٹیشن پر ریل کے ٹھہرنے کا ایک رومانی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر رک جاتی ہے۔ آپ نظریں اٹھاتے ہیں اور آپ کو پلیٹ فارم کی دوسری طرف محض دو چار ہاتھ کے فاصلے پر کوئی اور مسافر گاڑی کھڑی نظر آتی ہے۔ اب اتفاق دیکھیے کہ آپ کا ڈبہ جہاں رُکتا ہے، اس کے عین سامنے کے ڈبے میں کھڑکی سے لگی کوئی اُداس سی حسینہ بیٹھی ہوتی ہے جو آپ کی گاڑی کو رُکتے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیتی ہے۔ آپ جلدی سے اٹھتے ہیں بالوں کو سنوارتے ہیں، ٹائی کی گرہ درست کرتے ہیں اور جلدی سے واپس اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ آپ کے بیٹھتے ہی انجن کی سیٹی کی تیز آواز آپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور محبوبہ دلنواز کی گاڑی آپ کی تمناؤں اور آشاؤں کو کچلتی، ہولے ہولے پلیٹ فارم پر سے کُوچ کر جاتی ہے۔ اب آپ کے سامنے ایک خلا ہے، حسرتوں اور محرومیوں کے خلا جس میں ایک بُھدّا سا انجن چند مال گاڑیوں کا تعاقب کررہا ہے۔ آپ اس منظر سے نظریں ہٹا لیتے ہیں۔ لمبا سا سانس لیتے ہیں اور اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کردیتے ہیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ریل کے سفر کے ایسے کئی اور پہلو بھی ہیں، جن کے حق میں بہت کچھ کہا سنا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ریل کا سفر جسمانی آسائش کا موجب بھی ہے، یقین مانیے یہ ہوائی ضرور کسی دشمن نے اُڑائی ہے۔

(خیال پارے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) دورانِ سفر کون سی چیز مصنف کو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف دھکیل رہی تھی؟

ب) مصنف ریل کے سفر کی آسائش کو قبول کرنے کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتا؟

ج) مصنف ریل کے سفر کے دوران مطالعہ کیوں نہیں کر پاتا تھا؟

د) ریل کے سفر کے دوران لوگوں کا مزاج کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے؟

ہ) دورانِ سفر مصنف کو کس بات پر شرمندگی محسوس ہوئی؟

و) کون سی بات مصنف کو ریل کے سفر سے روکتی رہی؟

ز) اسٹیشن پر ریل ٹھہرنے کا رومانی پہلو کون سا ہے؟

۲۔ متن کے مطابق دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ریل کے سفر کے دوران میں مصنف کے لیے کتاب کا پڑھنا تھا۔

i) آسان	ii) مشکل
iii) کٹھن	iv) ناممکن

ب) ریلوے اسٹیشن پر ریل ٹھہرنے کا پہلو ہے۔

i) نفسیاتی	ii) سماجی
iii) اقتصادی	iv) رومانی

ج) مصنف کو ریل کے سفر سے تجربات حاصل ہوئے۔

i) تلخ	ii) خوشگوار
iii) ملے جُلے	iv) حیرت ناک

د) ریلوے اسٹیشن پر اشیاء فروخت کرنے والے مسافروں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

i) نفسیاتی	ii) جسمانی

(iii) اخلاقی (iv) دھونس دھمکی

ح) مصنف ریل کے سفر کے آسائش سے مطمئن نہیں۔

i) اقتصادی طور پر (ii) جسمانی طور پر

(iii) نفسیاتی طور پر (iv) رومانوی طور پر

۳۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''لیکن فطرت انسانی کی بوالعجبیوں کا یہ مطالعہ.............. کلبلاتی ہوئی مخلوق کا جزو بن جاتا ہوں''۔

۴۔ متن کے مطابق دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) مصنف نے ڈبے میں سوار ہوتے ہی مطالعہ شروع کیا۔

ب) مصنف دورانِ سفر رش کی وجہ سے جاگ گیا۔

ج) گاؤں میں زندگی کی رفتار سُست ہوتی ہے۔

د) ایک دفعہ مصنف نے موسم سرما میں ریل کا سفر کیا تھا۔

ہ) سبق ''ریل کا سفر'' صنفِ ادب کے لحاظ سے افسانہ ہے۔

۵۔ متن کے مطابق خالی جگہیں دُرست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) مضمون ''ریل کا سفر'' ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب .... سے لیا گیا ہے۔

ب) بقول مصنف ریل کا سفر انسانی فطرت کے.............. مطالعہ کے بعض نہایت قیمتی مواقع فراہم کرتا ہے۔

ج) دورانِ سفر ریل ہمارے.............. یا.............. اُبھر کر نمایاں ہو جاتی ہیں۔

د) مصنف بہت سے.............. مناظر کے لیے ریل کا سفر اختیار کرتا تھا۔

ہ) مصنف کو.............. کی طرح احساس ہوتا ہے کہ دوران سفر ہر منظر ہر چیز کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔

۶۔ سبق ''ریل کا سفر'' میں بیان کردہ کوئی ایک واقعہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۷۔ سبق ''ریل کا سفر'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۸۔ سبق ''ریل کا سفر'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۹۔ سفرِ ریل کس طرح سماجی یک جہتی و یگانگت کا مظہر ہوتا ہے۔ بیان کریں۔

آپ بیتی

''آپ'' کے معنی ہیں خود اور ''بیتی'' سے مراد وہ حالات اور کیفیت جس سے گزرے ہوں۔ گویا آپ بیتی سے مراد کہانی، نیا حال اور خودنوشت حالات۔ یعنی کسی شخص کا اپنی سرگزشت زندگی اپنے قلم سے تحریر کرنا، آپ بیتی کہلاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات یا کیفیت زبانی بیان کرے تو وہ زبانی آپ بیتی کہلائے گی۔ امتحان کے دوران طلبہ کو کسی انسان کی آپ بیتی لکھنے کے لیے کم کہا جاتا ہے۔ البتہ بے جان چیزوں مثلاً کرسی، کتاب، گلاب کے پھول، گدھے، گھوڑے، کرایے کے مکان وغیرہ کی آپ بیتی لکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی بے جان یا بے زبان چیز تو اپنی آپ بیتی نہیں لکھ سکتی۔ لہٰذا آپ اپنے تخیل سے کام لیکر اِس بے جان یا بے زبان چیز کی آپ بیتی اپنے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔ اور آپ بیتی لکھتے وقت اِن بے جان، بے زبان چیزوں کے حالات و واقعات اِن کی زبانی بیان کیے جاتے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ طلبہ سے کسی بھی سفر کا آنکھوں دیکھا حال لکھوائیں۔
۲۔ کسی بھی فن پارے میں علم بیان یعنی تشبیہ، استعارے، مجاز مرسل، کنایہ وغیرہ کی شناخت کروائیں۔
۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا کوئی اور مضمون بھی کمرہ جماعت میں سنوایا جائے۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو جدید ادب میں صنفِ مضمون نگاری کی اہمیت بتادیں۔
۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے اسلوبِ تحریر سے روشناس کروائیں۔
۳۔ طلبہ کو سبق ''ریل کا سفر'' کی روشنی میں معاشرے میں سماجی یک جہتی اور یگانگت کی اہمیت سے روشناس کروائیں۔

محمد حسین آزاد

(حالاتِ زندگی)

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۲۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی باقر علی نے ''اُردو اخبار'' کے نام سے سب سے پہلے دہلی میں اردو اخبار جاری کیا۔ آزاد نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر دلی کالج میں داخلہ لیا۔ اُستاد ابراہیم ذوق آپ کے والد کے دوست تھے۔ چناں چہ شاعری میں اُن کی شاگردی اختیار کی۔ جنگِ آزادی کے دوران آپ کے والد نے انگریزوں کے خلاف کالم لکھا۔ نتیجتاً اُنہیں گولی ماردی گئی۔ جائیداد ضبط کرلی گئی۔ لہٰذا آزاد چھپتے چھپاتے لاہور پہنچے۔

یہاں اُنہیں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی اور بچوں کی درسی کتابیں لکھنے کا کام سونپا گیا۔ اُسی دور میں آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی ایماء پر حالی سے مل کر جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ گورنمنٹ کے رسالوں ''اتالیق پنجاب'' اور ''پنجاب میگزین'' کے نائب مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ فارسی زبان سے خاص لگاؤ کے باعث دو دفعہ ایران کا سفر کیا۔ اور فارسی کا بغور مطالعہ کیا اور واپسی پر فارسی لسانیات کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔

آپ ایک عرصے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ ۱۸۶۵ء میں کسی سرکاری کام سے کلکتہ گئے۔ اُسی سال پنڈت من پھول کے ساتھ سرکاری سفارت کی غرض سے کابل اور بخارا کا سفر کیا۔ وکٹوریہ کے پچاسویں جشنِ تاج پوشی کے موقع پر اُنہیں ''شمس العلما'' کا خطاب دیا گیا۔

آزاد اُردو کے صاحب طرز ادیب اور بلند پایہ انشا پرداز اور جدید شاعری کے بانی ہیں۔ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت نثر میں اُن کا شاعرانہ اسلوب ہے۔ وہ اِس قدر شان دار لکھتے ہیں کہ قاری پر ایک سحر طاری ہوجاتا ہے۔ وہ خوبصورت تشبیہات اور استعارات کی بنا پر اپنی نثر کو اتنا رنگین بناتے ہیں۔ کہ نثر پر شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔

آزاد کی نثر سلیس ہے۔ اُنہوں نے قدیم اسلوب سے اِس کے حسن و جمال کے عناصر جب کہ جدید طرز سے سلاست لے لی۔ آزاد کے اسلوب کی ایک اور خصوصیت لفظوں کی بچت اور فقروں کا اختصار ہے۔ وہ لمبے لمبے فقرے لکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ ایک شگفتہ نگار انشا پرداز ہیں۔ اُن کی شگفتہ نگاری کا سحر ''آبِ حیات'' میں پورے آب و تاب سے نظر آتا ہے۔ آزاد الفاظ کے جادوگر ہیں وہ الفاظ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اُنہوں نے تاریخ نویسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آخری عمر میں بیٹی کی وفات نے ذہنی بیمار بنا دیا اور اسی حالت میں ۱۹۱۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔

زمانہ قدیم میں ہندوستانیوں کے طور طریقے

(مولانا محمد حسین آزاد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو جدید ادب میں صنفِ مضمون نگاری کی اہمیت سے روشناس کرانا۔
۲۔ اُردو ادب میں صنفِ مضمون نگاری کے ارتقا سے آگاہ کرنا۔
۳۔ مولانا محمد حسین آزاد کا اُسلوبِ تحریر بتانا۔
۴۔ طلبہ سے کسی ایک اقتباس کی تشریح کرانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

اعتقاد ۔ بودھ ۔ پورب ۔ گورستان ۔ کٹھن وقت ۔ قضائے الٰہی
پورس ۔ انجرہ ۔ دان پُن ۔ چِتا

جس زمانہ میں سکندر ہندوستان آیا، اُس عہد کا حال سنسکرت یا فارسی کی کتابوں میں نہیں۔ لیکن سکندر کے لشکر کے لوگ
لڑائیوں کے تمام حالات اور اسی حال میں جو جو باتیں اس ملک کی انہیں نئی معلوم ہوئیں، وہ بھی لکھتے گئے تھے۔ اسی طرح سو برس
ہوئے کہ چین کا ایک مسافر اپنے ملک سے ہزاروں کوس جنگل اور پہاڑ اُلٹ کر بڑے بڑے دریا اُتر کر ہندوستان میں آیا۔ یہاں
پھر کر بہت سے حالات اس ملک کے لکھے۔ وہ سب کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہوئیں۔ اللہ کی قدرت دیکھو کہ ہندوستان کا حال
ہندوستان میں نہ رہا۔ یہاں سے کبھی یونان اور کبھی چین کو گیا۔ وہاں سے انگلستان پہنچا۔ وہاں سے انگریزی کپڑے پہن کر پھر
ہندوستان میں آیا۔ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر بلخ سے افغانستان ہو کر اٹک پار ہوا۔
چینی مسافر لکھتا ہے کہ جہاں اب حسن ابدال اور راولپنڈی ۱۶کوس کے فاصلہ میں ہیں، اس وقت وہاں اور اس کے
گردو پیش میں تکشلا (ٹیکسلا) کا علاقہ بڑی رونق سے آباد تھا۔ یہ مقام اس زمانہ میں بڑا برکت والا گِنا جاتا تھا۔ اسی جگہ پر کہیں
بودھ نے اپنا سرکاٹ کر اللہ کی راہ میں بخش دیا تھا۔ اور یہاں سے یورپ کی طرف ایک اور جگہ مشہور تھی کہ جہاں اس نے اپنے
بدن کے گوشت کا ٹکڑا ایک بھوکے شیر کو کھلا دیا تھا۔ دونوں جگہ دو بلند منارے، خوبصورت عمارت، خوش رنگ پتھر اور قیمتی
جواہرات سے مرصع کھڑے تھے۔ بادشاہ اور بڑے بڑے امیر وزیر اور خاص و عام دنیا کے لوگ وہاں اعتقاد سے آکر نذریں
دیتے تھے۔ خوشبو جلاتے تھے۔ پھول چڑھاتے تھے جہاں شیر کو بدن کا گوشت کھلایا ہے، کہتے ہیں کہ مانکیالہ اسی جگہ کا نام ہے۔
اب تک بھی کہیں سے کھودتے ہیں تو اس زمانے کے بتوں بلکہ گھر کے اسبابوں اور پُرانے سکوں سے زمین بھری پڑی ہے۔ خیال
کرو تو تمام علاقہ اس زمانہ کی تاریخ کا گورستان معلوم ہوتا ہے۔

یونانی مؤرخ کہتا ہے کہ جب سکندر یہاں پہنچا تو تکشلا کے راجہ نے بڑی عظمت اور شان وشوکت سے سکندر کو اس کے لشکر سمیت مہمان رکھا اور تین دن کے بعد رخصت کیا۔ اگر چہ سکندر ایسا عظیم بادشاہ تھا کہ لوگ آج تک اس کے برابر کسی کو نہیں جانتے۔ لیکن اس کا قاعدہ تھا کہ اکثر لڑائیوں میں خود تلوار پکڑ کر عام سپاہیوں کی طرح لڑا کرتا تھا۔ اُس کا ایک گھوڑا بہت پیارا تھا۔ وہ بڑی بڑی لڑائیوں اور کٹھن وقتوں میں اس کا رفیق رہا تھا اور سکندر بھی اسے جان کے برابر عزیز رکھتا تھا۔ کئی معرکوں میں ایسا ہوا کہ چاروں طرف لڑائی ہورہی ہے۔ سکندر اس پر سوار تلواریں مارتا پھرتا ہے۔ اور حریف کے لشکر میں گھر کر کبھی زخمی اور کبھی زخموں سے بے ہوش ہوگیا۔ وہ سمجھ والا گھوڑا اُسے وہاں سے لیکر ایسا اُڑتا تھا کہ سب دیکھتے رہ جاتے تھے۔ جب اپنے لشکر میں پہنچتا تھا تو کچھ لوگوں کی آوازوں سے کچھ وضع اور پہناوے سے پہچان جاتا تھا کہ یہ اپنے لشکر کے آدمی ہیں۔ اُس وقت خاطر جمع سے ٹھہر جاتا اور نمک حلال جاں نثاران اپنے بادشاہ کو سنبھال لیتے۔

غرض کہ اسی علاقہ میں وہ گھوڑا قضائے الٰہی سے مرگیا۔ سکندر نے اس کی قبر بنوائی۔ اور اس کے نام پر ایک شہر آباد کیا۔ جہلم پار اُتر کر جو پورس (پنجاب کے راجہ) سے لڑ کر بڑے زور شور کا میدان مارا تھا، اُس فتح کی یادگار میں بھی ایک بڑا شہر آباد کیا تھا۔ افسوس کہ زمانہ کی گردشوں نے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا۔

پنجاب بھی اس زمانہ میں یہ پنجاب نہ تھا جو کہ دیکھتے ہو۔ دریائے جہلم سے ستلج تک پندرہ سو شہر اور قصبے برابر آباد تھے۔ جن میں سے کسی کی آبادی کوس بھر سے کم نہ تھی۔ گویا جہلم سے ستلج تک مسافر برابر آبادیوں میں چلا جاتا تھا۔ اس طرح اور علاقوں کو سمجھ لو۔

یونانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی بہت سی باتوں کو دیکھ کر وہ لوگ تعجب کرتے تھے۔ لیکن آج کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو اکثر باتوں پر ہمیں بھی حیرت آتی ہے۔ چناں چہ اس زمانے میں یہاں رسم تھی کہ غیر ملک کے مسافر کی خاطر داری بہت کرتے تھے۔ مگر وہ تین دن سے زیادہ ٹھہر نہ سکتا تھا۔ ملکِ ہند میں یونانیوں کا پہلا تعجب ہاتھی کے دیکھنے سے تھا۔ کیوں کہ اُن کے ملک میں یہ جانور نہیں ہوتا اور اس وقت تک یہ صورت انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی، اس کے علاوہ جب سکندر تکشلا میں لشکر لیے پڑا تھا تو وہاں کوئی عورت ستی ہونے والی تھی، اس کو دیکھا کہ زیور اور لباس پہنے باجے گاجے سے چلی جاتی ہے۔ اور لوگوں کا انبوہ گرد جاتا ہے۔ یہ نئی بات دیکھ کر سب یونانی متوجہ ہوئے۔ وہ اپنے بدن سے گہنا اُتارتی تھی اور برہمنوں کے حوالے کرتی جاتی تھی۔ چتا کے پاس پہنچ کر ایک ساعت ٹھہری اور کچھ اور دان پُن کیا اس وقت کوئی اُس سے اپنی کسی مراد کے لیے دعا چاہتا تھا، کوئی غیب کی باتیں پوچھتا تھا۔ غرض وہ خدا کو یاد کر کے اپنے خاوند کے مردے کے ساتھ چتا میں بیٹھی۔ اس انبوہ سے ایک ولولہ غل کا اُٹھا اور چتا سے شعلے بلند ہوئے۔ تھوڑی دیر میں بچاری جل کر بھسم ہوگئی۔ جب کہ وہ اس بے پروائی اور بے استغنائی سے چتا میں بیٹھی اور خاوند کے ساتھ آگ میں جل کر خاک ہوگئی تو یونانی حیران رہ گئے۔ یونانی مورخ یہ بھی کہتا

ہے کہ یہ دستور اِس زمانہ میں نیا نیا جاری ہوا تھا۔

تپسیا اور عبادت کے طریقے اس زمانہ میں بھی ایسے ہی تھے جو کہ اب ہیں اور یہ بھی یونانیوں کے لیے ایک عجیب بات تھی۔ چناں چہ سکندر نے ایک امیر کو بھیجا کہ ان سے جا کر ملے۔ اور ان کے خیالات اور حالات معلوم کر کے کچھ حاصل کرے۔ اس نے شہر کے باہر جنگل میں کئی فقیر مختلف حالتوں میں دیکھے کہ دھوپ میں تپ کر رہے ہیں۔ کوئی کھڑا ہے کوئی بیٹھا ہے مگر اس طرح کہ ذرا ہلتے جلتے نہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ''کلیانا'' تھا۔ وہ عمر میں نوجوان تھا اور جلتے پتھروں پر پڑا تھا۔ امیر مذکور نے اس کے پاس آ کر کچھ بات کی۔ کلیانا اس کی نئی وضع دیکھ کر اس طرح ہنسا کہ گویا اس کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا کہا تو یہ کہا کہ کپڑے پھاڑ کر ان جلتے پتھروں پر بیٹھ جاؤ اور اپنے تئیں فنا کرو، جب ہماری بات سمجھ میں آئے گی۔ اتنے میں ایک اور فقیر کہ سن رسیدہ تھا اور سب اس کی تعظیم کرتے تھے، وہ آیا اور اس نے آ کر کلیانا کو ملامت کی۔ اور اُن کے ساتھ نہایت اخلاق اور تواضع سے ملا۔ جو جو سوالات کیے، ان کے جواب دیے اور یہ بھی کہا کہ تم دل سے طالب ہو تو حکمت اور فقر کا علم، جس قدر ہمارے ہاں ہے، وہ میں تمھیں بتاؤں گا۔ سکندر نے چاہا کہ وہ سن رسیدہ آدمی میرے ساتھ چلے۔ مگر اس نے یہی کہا کہ جب تک جان اس مٹی کے پتلے میں اٹکی ہوئی ہے، تب تک ہمیں جس شے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مل جاتی ہے اور جب اس مصیبت زدہ رفیق سے یعنی قالبِ خاکی سے جدا ہوگئی تو پھر کچھ قباحت ہی نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ کلیانا کی طبیعت کچھ اور ہی طرح کی تھی اس کے ساتھ کے لوگ ملامت کرتے رہے۔ کہ خدائے باقی کو چھوڑ کر فانی کا ساتھ کیوں دیتا ہے۔ مگر اس کے دل میں بھی موج آئی کہ سکندر کے ساتھ ہولیا اور کسی کے کہنے پر خیال نہ کیا۔ یونانی لوگ اس کی بڑی خاطر داری اور عزت کرتے تھے۔ اور ہر طرح اُسے خوش رکھتے تھے۔ لیکن وہ ہندوستان کا رہنے والا تھا۔ سرد ملک کی ہوا موافق نہ آئی۔ فارس میں جا کر بیمار ہوگیا۔ اس کے پنتھ میں اول تو بیمار ہونا ہی بُری بات ہے اور اگر کوئی ہو جائے تو علاج کرنا اس سے برا تھا۔ چناں چہ بادشاہ نے طبیب حکیم علاج کے لیے بھیجے، مگر وہ ہرگز علاج کو راضی نہ ہوا۔ چند روز اسی حال سے گزرے۔ جب ناامید ہوا تو چاہا کہ یہ بدن جسے ہزار طرح کی بلائیں لگی پڑی ہیں، اسے جلا کر زندگی کے عذابوں سے بالکل چھوٹ جائے۔ یہ بات ایرانی اور یونانی کسی نے سنی بھی نہ تھی۔ وہ سب منتیں کرنے لگے کہ ایسا کام نہ کرے، لیکن جب کسی طرح نہ مانا تو اس کی خوشی بھی سب دل سے چاہتے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جو جو سامان مانگے، سب اسی طرح تیار کر دیں۔ ساتھ اس کے خاطر داری بھی بہت کی۔ اور روپیہ کپڑے زیور وغیرہ دے کر کہا کہ جسے چاہو آپ بانٹو۔ اس نے اپنا دان پُن کیا۔ جب سب سامان درست ہوگئے اور اسے چتا کی طرف لے چلے تو اس کے سر پر پھولوں کا تاج تھا اور اس کے چیلے ہندوستانی زبان میں آگے آگے بھجن گاتے اور باجے بجاتے جاتے تھے۔ وہ خوش وخرم چتا پر چڑھا۔ آپ آگ دینے کا اشارہ کیا اور جلنے کے عذاب کو اس طرح برداشت کر گیا کہ تمام یونانی قائل ہوگئے۔ اسی طرح ہندوستان میں پنتھ پنتھ کے فقیر جدا جدا رنگ میں تھے، جس طرح کہ اب دیکھتے ہو، یونانی ایک ایک کو دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔

جن فقیروں کو اب تیلیا راجہ کہتے ہیں، وہ جب بھی موجود تھے لوگ بڑے اعتقاد سے انہیں تیل دیتے تھے اور وہ سر پہ ڈال کر بدن پر بہا لیتے تھے۔ بعض فقیر فقط انگور یا انجیر ہی لیتے تھے۔ اکثر تِلوں کے لڈو لیتے تھے کہ اِن پر شہد پڑا ہوتا تھا۔ فقیروں کی عزت بہت تھی اور اشرافوں کے گھروں میں بے تکلف جاتے تھے۔ ان کے ہاں رسوئیاں کھاتے تھے۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ وکیل بھیج کر اپنے کاموں میں ان سے رائے پوچھتے تھے اور اسی طرح کرتے تھے۔

▼ہندوؤں میں طبابت کا فن تھا، اور بہت خوب تھا۔ اول مالش یا لیپ اور اوپری ترکیبوں سے کام نکالتے تھے۔ بہت سخت مرض کا علاج کھانے پینے کی دوا سے کرتے تھے۔ اکثر دواؤں کے تیزاب اور ست ایسے نکالتے تھے کہ اب تک لوگ حیران ہوتے ہیں۔ لیکن کاٹنے یا چیرنے پھاڑنے کے پاس نہ آتے تھے۔ بعض فرقے ایسے بھی تھے کہ دواؤں کا بالکل یقین نہ کرتے تھے۔ وہ فقط جھاڑ پھونک، جنتر منتر یعنی گنڈے تعویذ سے علاج کرتے تھے، بلکہ اِس سے ہر طرح کا مطلب حاصل کرتے تھے۔

(مقالات محمد حسین آزاد جلد اول)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) سکندر کہاں سے ہندوستان آیا؟

ب) چینی مسافر سکندر کے زمانے کے ہندوستان کے بارے میں کیا لکھتا ہے؟

ج) ٹیکسلا کا علاقہ اُس وقت کیوں برکت والا مانا جاتا تھا؟

د) ٹیکسلا کے راجہ نے سکندر کا استقبال کس انداز میں کیا؟

ہ) یونانی کتب کے مطابق لوگ ہمارے ملک کے حالات دیکھ کر کیوں حیران ہوتے تھے؟

و) ٹیکسلا میں یونانیوں کو ستی کی رسم نے کس طرح اپنی طرف متوجہ کیا اور کیوں؟

۲۔ متن کے مطابق دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ہند میں یونانی سب سے پہلے دیکھ کر حیران ہوئے۔

i) اُونٹ کو	ii) ہاتھی کو
iii) شیر کو	iv) سانپ کو

ب) مضمون ''زمانہ قدیم میں ہندوستان کے طور طریقے'' کے مصنف ہیں۔

i) مولانا الطاف حسین حالی　　ii) سرسید احمد خان

iii) خواجہ حسن نظامی　　iv) محمد حسین آزاد

ج) سکندر کے زمانے کی اکثر کتب ترجمہ ہوئے۔

i) فارسی میں　　ii) عربی میں

iii) انگریزی میں　　iv) اردو میں

د) سکندر کے زمانے میں بڑا پُر رونق تھا۔

i) ٹیکسلا　　ii) راولپنڈی

iii) حسن ابدال　　iv) لاہور

ہ) سکندر کے زمانے میں پندرہ سو قصبے آباد تھے۔

i) راوی اور جہلم کے درمیان　　ii) جہلم اور بیاس کے درمیان

iii) چناب اور ستلج کے درمیان　　iv) جہلم اور ستلج کے درمیان

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) سکندر کے زمانے کا حال اُس وقت کی فارسی اور سنسکرت کتابوں میں بکثرت ملتا ہے۔

ب) ٹیکسلا کے مقام پر سکندر کی افواج کو انتہائی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ج) سکندر اکثر لڑائیوں میں خود حصہ لیتا تھا۔

د) ہندوستان کے حالات یونانی کتب میں پڑھ کر لوگ حیران ہوتے تھے۔

ہ) سکندر کے زمانے میں مسلمانوں میں طبابت کا فن خوب موجود تھا۔

۴۔ متن کے مطابق خالی جگہ دُرست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) سکندر نے ایک شہر اپنے .... کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔

ب) سکندر کے زمانے کا حال ایک .... مسافر نے قلم بند کیا۔

ج) سکندر .... سے افغانستان کے راستے ہندوستان آیا۔

د) جلتے پتھروں پر چلنے والے نوجوان کا نام .... تھا۔

ہ) پنتھ میں بیمار ہونا .... بات سمجھی جاتی تھی۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق وسباق بھی لکھیں۔
''اکثر لڑائیوں میں خود تلوار پکڑ کر............ جاں نثاران اپنے بادشاہ کو سنبھال لیتے''۔

۶۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۷۔ اس سبق کا مرکزی خیال لکھیں۔

۸۔ اس سبق کی روشنی میں سکندر کی شخصیت پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔

۹۔ اس سبق کی روشنی میں سکندر کے زمانے کے ہندوستان میں طور طریقوں کا حال بیان کریں۔

۱۰۔ اس سبق کی روشنی میں سکندر کے زمانے کی ٹیکسلا کی تاریخ پر روشنی ڈالیں۔

مضمون نویسی

تعریف: وہ معلوماتی تحریر جس کا تعلق زندگی کے حقائق اور مسائل سے ہو۔ موضوع خشک اور واعظانہ نہ ہو اور ادبی انداز میں نہایت شگفتگی کے ساتھ لکھی جائے مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون (Essay) ایک ایسی صنف ہے جو جدید دور کی پیداوار ہے اور انگریزی کے توسط سے اُردو میں آئی ہے۔ اس میں ہر قسم کے مسائل پر اظہار خیال ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ مسائل سماجی، تہذیبی، ثقافتی، تنقیدی یا اقتصادی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ جو بات کہی جائے اختصار کے ساتھ کہی جائے۔ ورنہ مضمون مقالے کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔ مضمون میں کسی مسئلہ پر بحث تفصیل کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ کسی نکتہ اور کسی ایک بات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور مضمون نگار کسی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے شگفتگی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا بلکہ تھوڑی بہت خیال آرائی بھی کرتا ہے اور اس کی ذات کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ اُردو میں مضمون کا استعمال سب سے پہلے سرسید نے کیا اور ان کے مشہور رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہونے والے مضامین اس صنف کا اولین نمونہ ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی مضمون میں الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات کے استعمال کی معنویت کا ادراک کروائیں اور اُن سے نفسِ مضمون کا فہم حاصل کروائیں۔
۲۔ طلبہ سے ادب پارے کا مرکزی خیال، اہم نکات کا خلاصہ یا تشریح کروائیں۔
۳۔ کمرہ جماعت میں مولانا محمد حسین آزاد کے چند اور مضامین پڑھوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو صنف مضمون نگاری کی مختلف جہتوں سے آگاہ کریں۔
۲۔ اُردو ادب میں مضمون نگاری کی روایت پر روشنی ڈالیں۔
۳۔ اُردو نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات بیان کریں۔
۴۔ اُردو ادب میں مولانا محمد حسین آزاد کی خدمات پر ایک سیر حاصل گفتگو کریں۔

مولانا شبلی نعمانی

(حالاتِ زندگی)

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندوال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ ہی میں مولوی شکراللہ سے حاصل کی۔ پھر فارسی، عربی اور ادبیات کی تعلیم محمد فاروق صاحب سے غازی پور میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز کے سفر کیے۔ اُنیس برس کی عمر میں فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے گئے۔ اور سفر کے دوران وہاں کے کتب خانوں سے پورا فائدہ اُٹھایا۔

علامہ شبلی کے والد وکیل تھے۔ اُن کے اصرار پر شبلی نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لیکن جلد ہی بددل ہوکر یہ پیشہ چھوڑا۔ اور ''آمین دیوانی'' کی ملازمت اختیار کرلی۔ لیکن جلد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی جو علی گڑھ میں پڑھتے تھے؛ سے ملنے گئے۔ جہاں سرسید سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے آپ کو کالج میں پروفیسر مقرر کرلیا۔ وہاں سرسید کے کتب خانے سے استفادہ کا موقع ملا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران اُنہوں نے پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی بھی سیکھی۔

آخری عمر میں اعظم گڑھ آگئے اور وہاں ادارہ ''دارالمصنفین'' قائم کیا۔ اور اس کے لیے اپنا کتب خانہ، باغ اور مکان وقف کردیا۔ اِس ادارے نے اسلام و اسلامیات کے بارے میں قابلِ قدر کتابیں شایع کیں۔ انگریزی حکومت نے آپ کو علمی خدمات کے صلے میں ''شمس العلما'' کا خطاب دیا۔

شبلی نے سوانح عمریوں کے ذریعے مسلمانوں کو اُن کے درخشاں ماضی کی یاد دلا کر مستقبل کی تعمیر پر راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا بیان رنگین اور لہجہ پرجوش ہے۔ اُن کی تحریروں کو پڑھ کر جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ تحریر میں اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اُن کے چھوٹے جملوں میں وہ معانی ہوتے ہیں جو پوری عبارت میں بھی نہیں سماتے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں۔

اُن کی تحریروں کو پڑھ کر اُن کی علمیت کا رُعب بیٹھتا ہے۔ ان کی تحریر سادگی کے باوجود ایک عالم کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ وہ شاعری کے انداز میں اپنی نثر میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال کرتے ہیں اور نثر میں بھی اپنے شاعرانہ تخیّل سے بھرپور کام لیتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں طنز کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اُن کی نثر سلیس، رواں اور بے ساختہ ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں فارسی تراکیب کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ تاریخ نویسی اور تنقید نگاری میں اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

(مولانا شبلی نعمانی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو مسلمانوں کے قدیم طرزِ تعلیم سے آگاہی دینا۔
۲۔ مجازی اور اصلاحی مختصر سے طلبہ کو روشناس کرانا۔
۳۔ اُردو زبان وادب میں مولانا شبلی نعمانی کی خدمات کو تفصیل سے بتانا۔
۴۔ مولانا شبلی نعمانی کے طرزِ تحریر میں منفرد اسلوب کی نشان دہی کرنا۔

خاص الفاظ وتراکیب: تصنیف وتالیف ۔ اسماء الرّجال ۔ متعلقات ۔ حلقۂ درس ۔ مُستند ۔ مسافتوں
کامل شناسا ۔ بحث ومناظرہ ۔ درسگاہ ۔ پایہ شناس

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف وتالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلم وتعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے۔ جدید طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند وروایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا لیکن سو برس کی مدّت میں تمدّن بہت کچھ کر گیا اور اُسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتّب و باقاعدہ ہو چکی تھی۔ اس دور میں جن علوم کو رواجِ عام حاصل ہوا وہ معانی، لغت، فقہ، اُصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان سے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا۔ مگر رواجِ عام نہ حاصل کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اُس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت اور کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ ومنطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ دیکھو ٹیکس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رُک چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن وانتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستانِ عرب سے نکل کر دُور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں اور نہ ہی مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت اور تمدّن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم وفنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام اور اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی

صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہیں۔ جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں، اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علما کے ذاتی مکانات ہیں۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے عالیشان قصر وایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے اس سے کچھ زیادہ نہ ہوسکی۔ اگرچہ اس وقت اس زمانے کا کوئی رجسٹر موجود نہیں جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں، ہزاروں کتابیں موجود ہیں؛ جن سے ہم صحیح اندازے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، سپین کی تباہی اور تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں بنانے کی تاریخ نگاہ سے چھپ گئی ہے۔ تاہم ہر عہد میں ہم سینکڑوں ماہرین و مجتہدینِ فن کا نشان دے سکتے ہیں۔ صرف ہم عصر و ہم وطن اہلِ کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ ڈاکٹر سپرنگر (Dr. Sprenger) صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے۔

مشہور علما کے تعلیمی حالات پڑھو۔ ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم مشغولِ درس نظر آئیں گے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔

اُس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی املا جس کو اُردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ اُستاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب علم جو ہمیشہ قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے اُن تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اِس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہوجاتی تھی اور ''امالی'' کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دُور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہلِ کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اُٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہلِ فن کی لائف چھان ڈالو؛ اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا اُس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد، نیشاپور اور قرطبہ وغیرہ میں گو ہر فن کے کامل شناسا موجود تھے مگر اُن شہروں کے رہنے والے بھی مشرق مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔ علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا

حصہ انہیں علما کے حالات میں ہے جو سپین سے مصر، شام اور بغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر سپین میں داخل ہوئے۔ جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے ہمیشہ مسلمان سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے، بعض امرا اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب اور نحو وغیرہ پر علم کے لیے جداگانہ مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان میں علما اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصابِ تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پُراثر تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا جس میں اُس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں وہ طیلسان (چغہ) پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علما کا مخصوص لباس تھا۔

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے۔

۱) دینی تعلیم مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی۔ قرآن و حدیث (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ اتنے تعلق سے نحو، صرف، لغت، معانی اور اسماء الرّجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے۔ فلسفے نے علمِ کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی۔ اس سلسلے نے بڑھتے بڑھتے تقریباً ہر علم و فن کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا۔ اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے۔ جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے۔ جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے۔ جب کسی کام پر پوری توجہ مائل ہوگی تو اسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کر چکی تھیں مذہب نے ان کو بھی انہیں سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے اور چوں کہ وہ مدّت سے تمدّن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تھے، تعلیم کے معاملے میں انہوں نے اپنے استاد (عرب) سے زیادہ کام کیا ہے۔ یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول فقہ اور فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں۔

۲) تعلیم مسجدوں اور علما کی خاص درس گاہوں میں مقیّد نہ تھی۔ وزرا، حکام، فوجی افسر اور اہلِ منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ وزارت کے کثیرالاشغال وقت میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا۔ اہلِ کمال کے زمرے میں سیکڑوں گذرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب علم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

۴) امرا اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقینِ علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت

بڑا سبب تھا۔ سلاطین و وزرا تو ایک طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چوں کہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے بدل نہ تھیں بلکہ صرف اُن کا ذاتی کمال اور قبولِ عام مہنگے داموں خریدا جاتا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زورِ طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحبِ نظر اور نکتہ چیں تھے۔

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ نصابِ تعلیم قریباً وہی ہے جو پہلے تھے۔ پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک اُن پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدّت معین ہوچکی تھی، گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی۔ مثلاً مغرب (مراکو) وغیرہ میں سولہ برس اور تیونس میں پانچ برس طالبِ علم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔ املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کردیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق وامثال کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ نذر ہوگیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصودِ اصلی تھی اُن پر پوری توجہ ہوسکتی۔ تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا، اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا۔ پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ان مدرسوں میں فلسفہ ومنطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی۔

انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالکِ اسلامی میں ہوا کیے علمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے ایک خاندان گو کلیتاً برباد ہوجاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے۔ جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہوچکے تھے دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کرسکتی تھی۔ ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کردیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرّف نہ کرسکا۔ اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دیے جس کا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالکِ اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکامِ سلطنت اور عظمت وجلال قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات وصنائع کو مدرسوں کے احاطے سے باہر ڈھونڈنا

چاہیے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالم گیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا۔ ۷۸۴ھ میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا ہے یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

(مقالاتِ شبلی)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) ابتدا میں مسلمانوں کی تعلیم و تعلم کا کیا طریقہ تھا؟

ب) بقول مصنف تعلیم کا دوسرا دور کن دلچسپیوں سے بھرا ہے؟

ج) اُس دور کے درس و تدریس کے بارے میں علامہ ذہبی کیا لکھتے ہیں؟

د) اعلیٰ تعلیم کے لیے کیا ضروری تھا؟

ہ) تیسرے دور کے طرزِ تعلیم نے پہلے ادوار کے طرزِ تعلیم کو کس طرح متاثر کیا؟

و) ممالک اسلامی میں نئی حکومت کے استحکام کے لیے کونسی شرط لازمی تھی؟

۲۔ سبق کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) قدیم طرزِ تعلیم کا زیادہ تر تعلق تھا۔

i) تجربے سے ii) حافظے سے

iii) معلومات سے iv) فہم سے

ب) ڈاکٹر سپرنگر کے بقول مسلمان علما کی اسماء الرجال تھی۔

i) چار لاکھ ii) پانچ لاکھ

iii) چھ لاکھ iv) سات لاکھ

ج) دوسرے دورِ تعلیم کا مستند طریقہ تدریس تھا۔
i) تفتیش کا ii) بحث کا
iii) املا کا iv) منصوبے کا

د) دوسرے دورِ تعلیم میں ضروری خیال کیا جاتا تھا۔
i) ذاتی لائبریری کو ii) دور دراز سفر کو
iii) اتالیق مقرر کرنے کو iv) تحقیق و جستجو کو

ہ) قدیم دور میں جو شخص سفر کی زحمت اُٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہو جاتا تو لوگ اُسے دیکھتے تھے۔
i) رشک کی نگاہ سے ii) شک کی نگاہ سے
iii) حیرت کی نگاہ سے iv) غضب کی نگاہ سے

۳۔ سبق کے مطابق درج ذیل میں سے دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔
الف) تعلیم مسجدوں اور علما کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔
ب) اعلیٰ تعلیم کے لیے مناظرہ لازمی تھا۔
ج) پہلے اور دوسرے دور تعلیم میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی۔
د) تیسرے دور میں فلسفہ و منطق کی تعلیم عام تھی۔
ہ) اسلامی ممالک میں انقلابات حکومت نے تعلیم کو بہت تقویت دی۔

۴۔ سبق کے مطابق خالی جگہیں پُر کریں۔
الف) مغرب میں تعلیم سے فارغ ہونے کے لیے.................. برس کا عرصہ درکا تھا۔ (بارہ۔ چودہ۔ سولہ)
ب) املا کے طریقے کو چھوڑنے کی وجہ سے تیسرے دور کی تعلیم کو.................. کر دیا۔ (بہتر۔ ابتر۔ کم تر)
ج) تیسرے دور نے.................. تعلیم کی بنیاد ڈالی۔ (زبانی۔ علمی۔ کتابی)
د) بغداد کے علمی خزانے کو.................. نے برباد کیا۔ (ہلاکو خان۔ چنگیز خان۔ قبلائی خان)
ہ) قدیم دور میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی تعداد.................. ہوا کرتی تھی۔ (کم۔ زیادہ۔ مناسب)

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔
"تعلیم کا یہ دوسرا دور.................. حکومت اپنی بے تعلق اور اوپری ہے"۔

۶۔ سبق ''مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۷۔ درس وتدریس کے دوسرے دور کی چند خصوصیات بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ طلبہ کے درمیان قدیم طرزِ تعلیم اور جدید طرزِ تعلیم پر مباحثہ کرائیں۔

۲۔ مجازی اور اصلاحی محضر میں طلبہ سے ان کی ذاتی رائے لیں۔

۳۔ لائبریری میں موجود مولانا شبلی نعمانی کے دیگر اور مضامین کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو مسلمانوں کی قدیم طرزِ تعلیم سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو مولانا شبلی نعمانی کے اُسلوبِ تحریر سے واقفیت دلائیں۔

۳۔ اُردو زبان وادب کے لیے مولانا شبلی نعمانی کی خدمات پر مفصل لیکچر دیں۔

مہدی افادی

(حالاتِ زندگی)

اُردو کے مشہور ادیب اور نقاد مہدی حسن الافادی ۱۸۷۵ء میں گورکھپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی علی حسن کورٹ انسپکٹر تھے۔ مہدی کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی اور انہوں نے عربی، فارسی اور اُردو میں خاص دسترس حاصل کی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد سکول میں داخل ہو کر انگریزی پڑھی۔ گورکھپور سے میٹرک پاس کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ایف۔اے اور بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں تحصیل دار کی حیثیت سے ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔

مہدی افادی اُردو ادب کے شگفتہ و صاحب طرز انشاپرداز کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ علم الاعضا کے پروفیسر کی طرح اُردو میں نسوانی حسن کے جائزے اور توضیح کے معاملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اُردو میں طرز بیان مولانا محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی دہلوی کے ادب کا مجموعی عکاس ہے۔

وہ فطرتاً زندہ دل اور شگفتہ مزاج اور خوش مزاج آدمی تھے۔ ادب کا انہیں خاص ذوق تھا۔ اپنے عہد کے مشاہیرِ ادب مثلاً سرسید، شبلی اور نذیر احمد سے گہرے مراسم تھے۔ ان کی تحریروں میں ان بزرگ شخصیات کی دلچسپ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مہدی افادی کو نئے نئے الفاظ بنانے اور تراکیب کی تراش کا خاص ملکہ تھا اور عبارت کو بنانے سنوارنے میں خاص محنت کرتے تھے۔ اُن کی تنقید بھی انشاپردازی کے وصف سے خالی نہیں۔ وہ انگریزی ادب سے بہت متاثر تھے۔ انگریزی کی کئی تراکیب کو اُردو میں اس خوبی سے منتقل کیا کہ وہ اس میں رچ بس گئیں۔

اُن کی نثر، متین، سنجیدہ، سلیس، بے تکلف، رواں دواں اور دل نشیں ہے۔ تحریر میں روزمرہ، محاورہ بندی، بے تکلفی اور برجستگی جیسی وضاحت موجود ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا جابجا استعمال کرتے ہیں۔ ماہ نامہ ''نقاد'' آگرہ کے ابتدائی پرچوں میں شائع شدہ ان کے ادبی مضامین کے باعث انہیں غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔

مہدی افادی نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ ادبی زندگی کا کل سرمایہ وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً برصغیر کے ادبی رسائل میں چھپے اور بعد ازاں ''آفاداتِ مہدی'' کے نام سے مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے۔ خطوط کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ ان کے مکاتیب بھی ادب و انشا کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

اُردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ

(مہدی افادی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو ادب کے مختلف عناصر سے آگاہی دلانا۔
۲۔ طلبہ کو مہدی افادی کے طرزِ تحریر سے آگاہ کرنا۔
۳۔ اُردو نثری ادب میں مہدی افادی کا مقام بتانا۔
۴۔ اُردو نثر کے تدریجی ارتقا سے واقفیت دلانا۔
۵۔ عبارت میں معاون فعل تلاش کرنا۔

خاص الفاظ و تراکیب: نشاۃ الثانیہ ۔ سِکہ جمانا ۔ اقلیمِ سخن ۔ آنکھیں ملانا ۔ ادب القدما ۔ واجب التعظیم
تغیر پذیر ۔ تنقیداتِ عالیہ ۔ پیوندکاریاں ۔ لائقِ پرستش ۔ مجتہدانہ ۔ بازگشت

آئندہ زمانے میں اُردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو اُنیسویں صدی کا پچھلا دور اس کا ''نشاۃ الثانیہ'' (یعنی دورِ جدید) ہوگا۔ جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایہ ناز بے غایت شاعری کا مجموعہ خود رو تھا۔ منازلِ ارتقائی طے کرتی ہوئی اُس سطحِ امتیاز کے قریب پہنچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سِکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تک سے تک ملا لینا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا، گرمیِ محفل کے لیے چند مصرعوں کی پیوندکاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبک دوش کر دیتی تھیں، لیکن تقاضائے وقت کے ساتھ تغیرِ مذاق دیکھیے کہ آج ہم کو اُن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم دیکھتے ہی کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو، ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیرِ حالت کے ساتھ وہ آثارِ خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور وہ بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے اور ابھی معلوم نہیں مؤثراتِ خارجی اور واقعات کی قدرتی رَو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔

اس کشمکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقاتِ ارتقائی کی درمیانی کڑیاں آپ کو گِنائی جائیں، صرف یہ سمجھ لیجیے کہ بوسیدہ اور فانی اجزا کی جگہ قوی تر عناصر نے لی اور اقلیمِ سخن کی شریف تر ہستیاں عالمِ وجود میں آئیں، جن سے اردو، فلسفۂ ادب سے آشنا ہوگئی۔

میری غرض لائقِ عزت سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی سے ہے، جن کے قلم کے سائے میں اُردو یعنی کل کی چھوکری اتنی روادار ہوگئی کہ النساء یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص مختلف النوع خصائصِ ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کار کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب اُلقدما (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے، ایک وقت آئے گا، جب ان کے ادبیات کا بیش تر حصہ لائقِ پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا۔

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چوں کہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے، اس لیے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ میری خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں، میری غرض لائف نگاری سے نہیں ہے بلکہ صرف تنقیدِ ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں، جس میں بہ لحاظِ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیداتِ عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے۔

سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل اُن کے اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ اُن ہی کے قلم کی آوازِ بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لیے دلیلِ راہ بنی، آج جو خیالات بڑی آب وتاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر ہیں، دراصل اُسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں، ورنہ پہلے یہ جنسِ گراں اچھے اچھوں کی دسترس سے باہر تھی۔ سرسیّد کے کمالاتِ ادبی کا عدمِ اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالؔی نے آج کل کی بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھ کر منحرف طبائع کو سخت سے سخت شکست دی جو خیال میں آسکتی ہے، لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چلی ہے، حالاں کہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں، بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ خود لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے اور اُس کے لیے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ نذیر احمد کو میں ''شمس المارہروی'' توبہ! سید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا ہوں جنھوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری شایع کی ہے، بااستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا، یہ لکھیں گے اور ہمیں درانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے؛ اسی کی ضرورت ہے۔ نذیر احمد گو ایک حد تک ''عقلیات'' سے رسیاں تڑاتے رہے، لیکن ادب اور منقولات سے متعلق جو دفتر انہوں نے چھوڑا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارکس دینا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجے کی عربیت کے ساتھ بے مثال قدرتِ بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدتِ خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اُس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجیے۔ اُردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالبؔ کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے، اور وہ پیوندکاریاں جو اُن کی شُستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے، عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب اُن کی جدت اختراع اور قوتِ آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رَو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہوسکتی، اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب وتحلیل اجزائے السنہ، غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں۔ تاہم، متانت اور حُسنِ کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے جوان کے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے، نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرزِ ادا (اسٹائل) پر جو شارع عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے،

کوئی اثر پڑتا ہے، جو باتیں اوروں کے ہاں بے گانی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اِس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے، ادب چاہتا ہے، سبک نکتہ چینیوں سے اُن کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ باوصف کمالاتِ علمی جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاقِ سخن کی آزمائش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایتِ فن یہ اپنی قادر الکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفہء تاریخ وغیرہ، جس میں وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تصریح مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتائج کے ساتھ، غیر منقطع انضباطِ خیال کی ضرورت ہے۔ یہ قصداً اس طرف نہیں آتے، یہی حدِّ فاضل ہے جو شبلی کے قلم رو سے ان کے دائرہ کمالات کو جُدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لیکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوعِ سخن کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبہ، انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زورِ بیان کا قصور ہے جو اظہارِ فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا، جس کا کوئی رونکٹا بے کار نہیں۔ جہاں تک لائق ادب ''مشرقیت'' کا تعلق ہے۔ قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا کچھ اُٹھ گئے کچھ باقی ہیں۔ قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہو گئی، مگر ان کا حصہء غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں، اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئیڈیل) ہے، جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لیے جس قدر سرمایہء علمی انہوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم اُن کی قیمتی تصنیفات کو سینے سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے، دائمی جُدائی کے بعد، ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہا ہے۔

سرسید کے بعد اگر اُن کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں، یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجے کے ناثر بھی ہیں۔ لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے، جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے، کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے۔ طبیعت میں ایک جچا تُلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو وزوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوعِ بحث میں اُن نکاتِ متعلقہ کی طرف نہایت خوبصورتی سے فوری انتقالِ ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اُس بحث کی

جان ہوتے ہیں، لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیے جائیں، یہ سلاست ونفاست قدرتِ کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصے میں آئی۔

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجائش نہیں۔ چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منھ میں پھیرنا، خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں، جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چوں کہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا۔ اس لیے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفے کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات ونکتہ آرائیوں سے اُسے ایک مستقل فن بنا دیا۔ ''شعرالعجم'' کے چوتھے حصے میں فلسفہ وشاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس پر دنیا کی کوئی بھی زبان فخر کر سکتی ہے۔ ''ادب لاساتذۃ'' کا بہتر سے بہتر مرقع ہے۔

لیکن سا جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعے پر شبلی پر ملک کے چپے چپے سے لے دے شروع ہوگئی، اور اس قدر شور وغل ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے، کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہرگز نہیں! صرف حاسدین کی کم نظری تھی، دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزشِ قلم سے ٹپکی اور بُری طرح ٹپکی۔

لیکن شرافتِ علم دیکھیے! شررؔ کو، جو ''شبلی'' پر کبھی بھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے، اس ناگوار واقعے کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی، وہ صاف صاف کہہ گزرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا، شبلی کی وجہ سے تھا۔ اب وہ ایک جسدِ بے رُوح ہے۔ اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا۔

بہرحال، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اُٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں، میرے خیال میں سید عبدالماجد اگر فلسفۂ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے، جس اہتمام سے الکلام پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی، تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر، مگر دراصل سرِفہرست، آزاد پر خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں، آزاد اس پائے کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرے کے اور خلاقینِ سخن کو اُن کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خوبصورتی کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگیِ زبان اور آزاد کا خاص اندازِ بیان ہے جس سے اُن کی نثر عموماً زرنگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں، جس نے شوخی سے عالمِ فطرت (نیچر) کمالِ صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے، خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرشِ ریشمی پر بکھر جانا روانیِ آب سے زیادہ دل کش ہے، مگر اس سے زیادہ تر دل کش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مُرصع پیداوارِ دماغی جو حسنِ صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اُس کے سلیس ونفیس لٹریچر کا یہ وصفِ اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اِس لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بارِ طبیعت نہ ہو اور

فسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے میرا خیال ہے، لائق ذکر خصائص میں سے ہے۔ جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ "آزاد اُردوئے مُعلّیٰ کا ہیرو ہے"۔ جس طرح تاریخ میں فلسفے کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چڑھایا ہے، اُردو کو انشا پردازی کے درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے، لیکن آزاد کی ادبی فتوحات، تاریخِ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے، جس کا فیصلہ خود فلسفہ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔

سرسید سے "معقولات" الگ کر لی جیسے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی، جہاں تک نثر کا تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن "آقائے اُردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں، جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لیے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں "افسانہ یارانِ کہن" کہیے۔

بہر حال، ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے، اکبری نورتن کے مقابلے میں بعض صاحبوں کو یہ تجدید پسند نہ آئے گی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ "مصنفین کی صفِ اوّل" میں اس سے زیادہ گنجائش معلوم نہیں ہوتی، تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علیحدہ ہو کر اگر کوئی صاحب (بہ شرط یہ کہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکے تو میرا خیال ہے میں اُس پر غور کرنے کے لیے ایک حد تک تیار ہوں۔

(آفادات مہدی)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مہدی افادی کا "عناصرِ خمسہ" سے کیا مراد ہے؟

ب) مہدی افادی کلاسکس کی اہمیت پر کیوں زور دیتے ہیں؟

ج) مصنف کے خیال میں سرسید نے ادب اور معقولات پر کون سا رنگ چڑھایا اور کیسا؟

د) مہدی افادی علامہ نذیر احمد کی تخلیقات پر رائے دیتے ہوئے کیوں پریشان دکھائی دیتے ہیں؟

ہ) مہدی افادی سرسید کے بعد مولانا حالی کو کس طرح اُن کا جانشین قرار دیتے ہیں؟

و) مصنف اُنیسویں صدی کے پچھلے دور کو نشاۃ الثانیہ سے کیوں تعبیر کرتے ہیں؟

ز) مہدی افادی بیسویں صدی میں علامہ عربی کس ادیب کی موت کے ساتھ دفن سمجھتے ہیں اور کیوں؟

۲۔ سبق "اُردو لٹریچر کا عناصرِ خمسہ" کے متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کیجیے۔

الف) مہدی افادی نے اعلیٰ درجے کی مربیّت کا ذکر کیا ہے:

i) سرسید احمد خان کی　　ii) مولانا نذیر احمد کی

iii) مولانا الطاف حسین حالی　　iv) علامہ شبلی نعمانی کی

ب) مہدی افادی فطری تاثر سمجھتے ہیں:

i) مولانا الطاف حسین حالی کو　ii) علامہ شبلی نعمانی کو

iii) مولانا نذیر احمد کو　iv) مرزا غالب کو

ج) ''شعر العجم'' کا مصنف ہے:

i) مولانا نذیر احمد　ii) سر سید احمد خان

iii) مولانا الطاف حسین حالی　iv) علامہ شبلی نعمانی

د) مہدی افادی سر سید احمد خان کے علمی کارناموں کو اُجاگر کرنے کے لیے اہم سمجھتے ہیں:

i) سجاد یلدرم　ii) سید سلیمان ندوی

iii) ڈاکٹر وزیر آغا　iv) احمد ندیم قاسمی

ہ) بقول مہدی افادی بعض ادیب مولانا محمد حسین آزاد کی سے نالاں تھے:

i) ہندی　ii) مشکل ہندی

iii) تنقیدی رویے　iv) جدید طرزِ تحریر

۳۔ سبق ''اُردو لٹریچر کا عناصر خمسہ'' کے متن کی روشنی میں درست جُملے کی نشاندہی (✓) اور غلط کی (✗) سے کریں۔

الف) مولانا محمد حسین آزاد کو ''اُردو دور کا ہیرو'' کہا گیا ہے۔

ب) مولانا الطاف حسین حالی کو سوانح عمری ''علامہ شبلی نعمانی'' نے شایع کی ہے۔

ج) سر سید احمد خان لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ رکھتے تھے۔

د) مہدی افادی سر سید احمد خان کے معقولات کو اہم نہیں سمجھتے تھے۔

ہ) آزاد کا خاص اندازِ بیان ''پاکیزگیِ زبان'' ہے۔

۴۔ سبق ''اُردو لٹریچر کا عناصر خمسہ'' کے متن کے مطابق خالی جگہ درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) ارکان خمسہ کی تجویز.............. کے مقابلے میں بعض ادباء کو پسند نہیں آئے گی۔

ب) مہدی افادی مصنف.............. کے لیے انشا پردازی ہی کافی سمجھتے ہیں۔

ج) شعر العجم میں.............. کا بہتر سے بہتر مرقع پایا جاتا ہے۔

د) مہدی افادی کے مطابق مولوی عبدالحق.............. کے کلام پر دادِ سخن دیکھیں گے۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''ایک مغربی شاعر کے خیال میں.............. آزاد اُردو دور کا ہیرو ہے۔

۔ اس سبق میں مہدی افادی کے اسلوب تحریر پر ایک مضمون تحریر کریں۔

۷۔ اس سبق میں بیان کیے گئے ادباء کے اسلوبِ تحریر کا آپس میں موازنہ کریں۔
۸۔ اس سبق کا مرکزی خیال مختصراً تحریر کریں۔
۹۔ اس سبق کا خلاصہ تحریر کریں۔

فعل

تعریف: فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا، ہونا، یا نہ کرنا، نہ ہونا زمانے کی قید کے ساتھ پایا جائے۔ یعنی ماضی، حال اور مستقبل۔ ان تینوں زمانوں میں سے ایک ضرور پایا جائے گا۔ مصدر اور فعل میں فرق یہی ہے۔ کہ مصدر میں کسی کام کے کرنے یا ہونے کا عمل تو پایا جاتا ہے لیکن اِس میں زمانہ نہیں ہوتا۔ مثلاً اسلم دوڑتا ہے۔ اس جملے میں دوڑنا فعل ہے۔

امدادی افعال سے فعل بنانا: کام کو فعل کہتے ہیں بعض اوقات ایک جملے میں ایک سے زیادہ افعال استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں ایک بنیادی فعل ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرا بنیادی فعل کی امداد کرتا ہے۔ وہ دوسرا فعل جو بنیادی فعل کی مدد کرتا ہے۔ امدادی فعل کہلاتا ہے۔ مثلاً اسلم ہنس پڑا۔

امدادی فعل کا مقصد بات زیادہ واضح کرنے اور بات پر زور دینے کے ساتھ ساتھ کلام میں حسن و خوبی، فصاحت و بلاغت اور لطافت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ امدادی فعل کی مدد سے کلام یا بات میں بے شمار لطیف معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ امدادی فعل سے اصل فعل کی کیفیت و حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اور زمانے (ماضی، حال اور مستقبل) کی صحیح حالت کا تعین کرتا ہے۔ فقروں کی تکمیل اور تشریح کرتا ہے۔ امدادی فعل دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱) ایسے افعال جو اصل افعال کے معانی کی تکمیل کرتے ہیں۔ ۲) ایسے افعال جو اپنے کچھ نہ کچھ معانی بھی ضرور دیتے ہیں۔

معاون افعال: اُردو میں بالعموم استعمال ہونے والے امدادی افعال مندرجہ ذیل ہیں۔

آنا۔ اٹھنا۔ پڑنا۔ جانا۔ چاہتا۔ چلنا۔ دینا۔ رہنا۔ رکھنا۔ سکنا۔ کرنا۔ لینا وغیرہ

مثلاً میں کوئٹہ سے ہو آیا ہوں۔ وہ میرا سارا روپیہ دبا بیٹھا۔ خبردار! کوئی اندر نہ آنے پائے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مذکورہ پانچ شعرا و ادبا کی زندگی سے متعلق مضامین لکھوائیں۔
۲۔ کمرۂ جماعت میں طلبہ کے درمیان اسلوبِ تحریر پر مباحثہ کروائیں۔
۳۔ کسی بھی علمی تحریر پر تنقیدی گفتگو کروائیں۔
۴۔ طلبہ سے سبق میں موجود چند امدادی افعال تلاش کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو مہدی افادی کے اسلوبِ نثر سے آگاہ کریں۔
۲۔ اُردو نثر کا تدریجی ارتقا بتائیں۔
۳۔ اُردو نثر میں مہدی افادی کے مقام سے آگاہ کریں۔

مولانا صلاح الدین احمد

(حالاتِ زندگی)

مولانا صلاح الدین ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء کو مولوی احمد بخش کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوا اور اُن کی تربیت اُن کی والدہ ماجدہ نے کی۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ لاہور میں حاصل کی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔اے کیا۔ اسی دوران ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے زیر اثر انہوں نے کالج کو خیر باد کہہ دیا۔ بعد میں نیشنل یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے کے بعد ان کے دل میں جذبہ نفرت شدت اختیار کر گیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ انگریزوں کی ملازمت نہیں کریں گے۔

یتیمی کے باعث ابتدائی زندگی عُسرت میں بسر ہوئی۔ ابتدا میں ''انصاف'' اخبار میں ملازمت اختیار کی۔ بعد میں اپنے بچپن کے دوست منصور احمد کے تعاون سے رسالہ ''خیالستان'' جاری کیا۔ مگر یہ رسالہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا نے پہلے ایڈورٹائزنگ ایکسپریس کمپنی اور پھر پبلسٹی لمیٹڈ کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اُردو کا سب سے ستا ماہنامہ ''ادبی دنیا'' جاری کیا۔

مولانا کو ادبی ماحول بچپن ہی میں میسر آ گیا تھا۔ وہ اُردو زبان کے مشہور نقاد تھے۔ ان کی تنقید تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں تھے بلکہ اُن کے ہاں تنقید برائے صداقت و اصلاح کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ بے لاگ تنقید کر کے نقاد حضرات کے لیے ایک راستہ متعین کر دیا۔

مولانا صلاح الدین احمد نے طنز و مزاح سے اپنی تحریروں کو شگفتہ اور مؤثر بنانے کا کام لیا۔ انہوں نے متانت کی فضا کو مزاح سے شگفتہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور یوں اپنی ادبیت کے وقار اور معیار کو قائم رکھا۔ انہوں نے طنز کو معاشرتی اصلاح کے حربے کے طور پر استعمال کیا۔ اُن کی تحریروں میں بذلہ سنجی اور خوش مزاجی موجود ہے۔

مولانا کی تحریروں میں اُن مقامات پر زیادہ جوش اور ولولہ موجود ہے۔ جہاں آپ قوم کی آزادی اور مسلمانوں کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر آپ کی تحریر میں روانی اور برجستگی پیدا ہو جاتی ہے جو پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتی ہے۔

مولانا کا اندازِ نگارش سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ وہ سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ تکلف اور بناوٹ سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں بے ساختگی، نرمی، روانی اور سلاست جیسی صفات بدرجہ اُتم موجود ہیں۔

۱۹۶۴ء میں لاہور میں وفات پائی۔

کہنے کی باتیں

(مولانا صلاح الدین احمد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو قدیم اور جدید شاعروں کے فرق سے آگاہی دینا۔
۲۔ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔
۳۔ دفتری احکام، یادداشتیں، نکاح کے فارم وغیرہ سمجھ کے ساتھ پڑھ کر پُر کروانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

ہجومِ زار ۔ متمول ۔ محفلِ سماع ۔ ضمیمہ ۔ اربابِ نشاط ۔ طبائع ۔ طرحی غزلیں
کشاں کشاں ۔ سخنوری ۔ تحت اللفظ

کسی صاحبِ نظر کا قول ہے کہ ہماری غزل مشاعرے کی گود میں پلی ہے۔ میں اس پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ غزل کی جوانی بھی مشاعروں ہی میں چمکی اور اس کی پختگی بھی؛ اسی ماحول میں اپنے کمال کو پہنچی۔ مگر زمانے کا رنگ دیکھیے کہ وہی غزل جس کے پرتوِ حُسن سے مشاعرے جلوہ زار بن جاتے تھے اب ان محفلوں میں بار تک نہیں پاتی اور سچ پوچھو تو یہ محفلیں بھی نام کو رہ گئی ہیں۔ ورنہ ان کا انداز ایک ہجوم زار سے کچھ مختلف نہیں ہوتا اور ان کا انعقاد تو شرمناک حد تک ارزاں اور بے معنی ہو گیا ہے۔

پچھلے دنوں پنجاب کے ایک متمول ضلع میں ایک مجلسِ مشاعرہ اور ایک محفلِ رقص و سرور بیک وقت منعقد کی گئیں۔ مشاعرہ ضلع کے صدر مقام میں اور دوسری محفلِ سماع ایک معمولی سی تحصیل میں منعقد ہوئی۔ مقصد دونوں کا ایک تھا۔ مشاعرے کے مہتمم، صاحبِ ضلع اور محفل کے کرتا دھرتا پولیس کے ایک تھانیدار صاحب تھے۔ سنا گیا ہے کہ حصولِ مقصد کے اعتبار سے بزمِ سرود مشاعرے سے زیادہ کامیاب رہی۔

ہمارے ایک دوست یوپی میں کسی ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین ہیں، وہاں ہر سال ایک صنعتی نمائش ہوتی ہے کل ان کا ایک خط ہمیں ملا جس میں فرماتے ہیں کہ "اس سال نمائش کے ضمیمے کے طور پر یہاں ایک آل انڈیا قسم کا مشاعرہ بھی ہو رہا ہے اور مجھے اس کے انتظامات کے سلسلے میں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں"۔ سبحان اللہ! بچپن میں ہم نے بھی ایک دفعہ میرٹھ کی سالانہ نمائش دیکھی تھی۔ نوچندی کا میلہ تھا اور جابجا اربابِ نشاط کے ڈیرے لگے ہوئے تھے، لوگ باگ میلہ دیکھ کر فارغ ہوتے تو ان خیموں میں آ کر آنکھوں کا نور اور کانوں کا سرور حاصل کرتے ہیں، غالباً اسی لیے ان کی جگہ آل انڈیا قسم کے مشاعرے برپا کیے جاتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ عوام و خواص مشاعروں کی نسبت ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہ مشاعرے کو تفریح کا ایک

مہذب ذریعہ سمجھتے ہیں، حالاں کہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک مشاعرے کی تفریحی قدر Entertainment Value بہت کم ہے اور واقعی کم ہونی چاہیے۔ اگر آپ کو کسی نیک مقصد کے حصول کے پیشِ نظر عوام کے لیے کوئی موقعِ تفریح مہیا کرنا ہے اور اس کے بدلے اُن سے زرِ نقد وصول کرنا ہے اِن کی طبائع پر کوئی اثر ڈالنا ہے تو اس کے لیے بیسیوں بہتر ذرائع موجود ہیں۔ مشاعرے جیسے خالص علمی اور ادبی ادارے کو آپ کیوں اس کی سطح سے گراتے ہیں مگر اس میں اربابِ اختیار کا چنداں قصور نہیں بلکہ ہمارے بیش تر شعرا کو یہ خود احساس نہیں کہ ان کی حیثیت ایک سنجیدہ حیثیت ہے اور انہیں عوام کی ارزاں تفریح کے لیے نہیں، بلکہ سماج کے ذہنی نشو و ارتقا کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہمارے موجودہ مشاعروں کا ماحول خالص تفریحی ہوتا ہے اور سامعین کی بیش تر تعداد وہاں لطفِ سماع یا تسکین ذوقِ مزاح کے لیے جاتی ہے اور دونوں مشاغل میں دل کھول کر حصہ لیتی ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب مشاعروں کے لیے خالص طرحی غزلیں لکھی جاتی تھیں۔ ہفتوں پہلے استاد اپنے شاگردوں کو نکتے سمجھاتے تھے، ان کی زبان صاف کرتے تھے، ان کے انداز نکھارتے تھے۔ پھر جب مشاعرے میں آمنے سامنے یہ غزلیں پڑھی جاتی تھیں تو نکتہ وری بے طلب داد دیتی تھی اور فن کاری حوصلہ پا کر نئی بلندیوں تحریک یا تقریب کے محتاج نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی آمدنی کا ذریعہ بنتے تھے۔ ان میں وہی لوگ شرکت کرتے تھے جنھیں ذوقِ سخن وہاں کشاں کشاں لے جاتا تھا۔ قہقہوں، چیخوں اور بدتمیزی کے دیگر مظاہر کو یہاں مطلق دخل نہ تھا۔ نومشق شعرا ڈرتے ڈرتے شعر پڑھتے اور پختہ کار استاد مصرع اٹھاتے اٹھاتے اصلاح دے جاتے۔ پھر اگر سخنوری کے نکتے اور فن کی خوبیاں ایسی مجالس میں نہ اُبھرتیں تو اور کہاں فروغ پاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری غزل نے مشاعرے کے زیرِ تربیت ایسی ترقی کی کہ اس کی نظیر نایاب ہے۔

یا پھر یہ زمانہ ہے کہ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہے اور ان میں سے بیش تر حضرات کچھ سننے کے لیے نہیں بلکہ محض آوازے کسنے کے لیے تشریف لائے ہیں اور جو شاعر اسٹیج پر آتا ہے، اس سے ترنم کی فرمائش کرتے ہیں کیونہ نہ ہو صاحب، آخر اسی چیز کے لیے تو انہوں نے چونی کا ٹکٹ خریدا ہے، ورنہ وہ دو پیسے اور ڈال کر سنیما ہی نہ چلے جاتے اور وہاں مزے سے منّی جان کے ایک نہ دو اکٹھے تیرہ گانے سُن کر آتے۔ ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ کسی بدنصیب شاعر نے کوئی اچھی سی غزل تحت اللفظ پڑھنی شروع کی اور ترنم باز حضرات کی صفوں میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جو چشمِ زدن میں ایک خاصہ ہنگامہ بن گئی۔ اب شاعر بار بار کوشش کرتا ہے کہ حاضرین کی کم از کم تعداد ہی اس کا ایک آدھ شعر سن لے اور صاحبِ صدر بھی بار بار للکارتے ہیں مگر توبہ، یہاں چونی حلال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آخر شاعر نا کام اپنا سا منہ لے کر سٹیج سے اُتر جاتا ہے اور اس کی جگہ لپک کر ایک گلے باز حضرت تشریف لے آتے ہیں اور پہلا مصرع ہی اس طرح گہرا کر پڑھتے ہیں کہ شور و غوغا دھیما ہوتے ہوتے ایک گنگناہٹ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے مصرعے کے آتے آتے مکمل خاموشی چھا جاتی ہے اور پھر داد جو ملنی شروع ہوئی تو اللہ دے

اور بندہ لے۔ بچ تھپتھپائے جارہے ہیں۔ تالیاں، ایک مقررہ تال پر سرور ساتھ دیے جاتی ہیں اور ٹیپ پر پہنچتے پہنچتے ٹوپیاں اچھلنے لگتی ہیں اور تحسین و مرحبا کی صداؤں سے ہال کی چھت اُڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

ہمارا خیال بلکہ اعتقاد ہے کہ اس بے تکے ماحول میں فن اور فن کار دونوں پستی کی جانب جارہے ہیں۔ فن کار کے دل سے اپنی صحیح قیمت کا احساس مِٹ چکا ہے وہ ایک تفریح طلب پبلک کا مطالبہ بے چُون و چرا پورا کر دیتا ہے اور اس کے صلے میں ایک ارزاں قسم کی شہرت یا بعض صورتوں میں چند کاغذی سکّے بہ رضا و رغبت قبول کر لیتا ہے۔ بعض طبع حضرات ایک ہی نظم دو دو برس تک مختلف مشاعروں میں سناتے رہتے اور کہیں سے خراجِ تحسین اور کہیں سے باج نقد وصول کیے چلے جاتے ہیں۔

مگر نظم ہے کہ باسی ہونے میں نہیں آتی۔ وہ طرحی غزلوں کا دور گیا جب کسی مشاعرے میں چمکنے کے لیے خونِ جگر پینا پڑتا تھا، اب ترقی کا زمانہ ہے ان باتوں کا کون پوچھتا ہے۔ ایک سڑی بُھسی نظم جیب میں ڈال لی اور اپنا مزے سے مدّتوں کام چلاتے رہے، نہ انہیں تکلیف نہ مشاعرے والوں کو پریشانی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش اور پبلک اپنی جگہ۔ بلکہ پبلک تو اپنی خوشی اور طرح بھی پوری کر لیتی ہے مثلاً کسی امدادی چندے کے سلسلے میں کوئی مشاعرہ ہے۔ اب منطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ شعرائے کرام ایسی چیزیں سنائیں جو پیشِ نظر مقصد سے بھی کچھ مناسبت رکھتی ہوں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے بلکہ اگر کسی شاعر نے موقع و محل کے اعتبار سے مثلاً سپاہی کی بیوہ پر نظم پڑھنی شروع کی تو پیچھے سے آوازیں آنے لگیں گی راج کماری، راج کماری۔ غالباً آپ کی ایک مشہور رومانی نظم ہے اور پبلک آپ سے یہی چیز سننا بلکہ گوانا چاہتی ہے۔ اب شاعر اگر عقل مند ہے اور اپنی بے آبروئی نہیں کرانا چاہتا تو بیوہ کو چھوڑ کر راج کماری گانے لگ جائے گا۔ بہت برس گزرے بعینہ ایسی ہی صورت لاہور کے ایک مقامی تھیٹر میں تقریباً ہر روز پیش آیا کرتی تھی۔ ماسٹر لبھو ایک خوش گلو ایکٹر تھے اور اس زمانے میں لالہ نانک چند کی تھیٹریکل کمپنی سے وابستہ، اُن دنوں لاہور میں ایک گانا بہت چل رہا تھا۔ ''چھوٹی بڑی سوئیاں''۔ اب کمپنی نے ایک المیہ کھیل لگا رکھا ہے مثلاً ''ہملٹ یا خونِ ناحق'' ماسٹر لبھو اس کے ایک سین میں ہملٹ بنے۔ اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہیں اور اسی سلسلے میں وہ ایک پُرسوز نوحہ شروع کر دیتے ہیں مگر پبلک کو اس گانے سے چنداں دلچسپی نہیں۔ معاً پچھلی گیلری میں سے ایک آواز ہوتی ہے ''سوئیاں'' اور سا کے اٹھتے ہی ہال کے ہر کونے سے ''سوئیاں، سوئیاں'' کی پُرزور آواز آنے لگ جاتی ہیں۔ اب ماسٹر لبھو کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے پُرسوز و پُرالم نوحہ کو چھوڑ کر سوئیاں گانے لگ جائے۔ ذرا خیال فرمائیے! شہزادہ ہملٹ سیاہ ماتمی لباس زیب تن کیے، اپنے باپ کا مرثیہ پڑھنے کی بجائے سوئیاں گا رہا ہے اور پبلک مزے لوٹ رہی ہے۔

قریب قریب یہی کیفیت ہمارے ان شاعروں، مشاعروں اور شاعرہ باز حضرات کی ہے اللہ اپنا رحم کرے۔

(مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

(الف) مشاعرے غزل کے ارتقا میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟

ب) بزمِ سرور مشاعرے سے کیوں کامیاب رہی؟

ج) عوام و خواص مشاعروں کے بارے میں کس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں؟

د) مصنف مشاعرے کی تفریحی قدر کو کیوں کم سمجھتے ہیں؟

ہ) پچھلے زمانے میں کس قسم کے مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا؟

و) کس قسم کے شاعر حضرات کو ناظرین زیادہ پسند کرتے تھے؟

ز) بہ قول مصنف اس طرح کے ماحول میں فن اور فن کاروں کس طرح پستی کی جانب گامزن ہوتے ہیں؟

۲۔ سبق کے متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

(الف) سٹیج پر شاعر سے فرمائش ہوتی تھی۔

(i) ترنم کی (ii) غزل کی

(iii) نظم کی (iv) تحت اللفظ کی

ب) کہنے کی باتیں تخلیق ہے:

(i) محمد حسین آزاد کی (ii) شبلی نعمانی کی

(iii) ڈاکٹر وزیر آغا کی (iv) مولانا صلاح الدین احمد کی

ج) صنفِ ادب کے لحاظ سے "کہنے کی باتیں" ہے:

(i) افسانہ (ii) ناول

(iii) داستان (iv) طنز و مزاح

د) مصنف شاعر کو سمجھتا ہے:

(i) تفریح کا ذریعہ (ii) سماج کی نشو و ارتقا کا ذریعہ

(iii) تعلیم و تربیت کا ذریعہ (iv) چندہ جمع کرنے کا ذریعہ

ہ) مصنف کے زمانے سے پہلے رواج تھا:

(i) طرحی مشاعروں کا (ii) فرشی مشاعروں کا

(iii) تفریحی مشاعروں کا (iv) رومانوی مشاعروں کا

۳۔ سبق کے متن کے مطابق درست کی نشاندہی (✓) اور غلط کی (✗) سے کریں۔

الف) موجودہ دور میں طرحی مشاعروں کا رواج نہیں رہا۔

ب) مشاعرہ محفل سرور سے زیادہ کامیاب رہا۔

ج) ناظرین تحت اللفظ غزل سننے کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔

د) ترنم سے غزل پڑھنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی۔

ہ) مصنف کے زمانے کے اکثر مشاعروں کا ماحول خالص تفریحی ہوا کرتا تھا۔

۴۔ سبق کے متن کے مطابق خالی جگہ درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) غزل کی ترقی میں.................. کا بڑا کردار ہے۔ (مشاعروں / رسالوں / شعرا)

ب) مصنف کے زمانے میں مشاعروں میں بیش تر حضرات.................. کے لیے تشریف لاتے تھے۔
(آوازے کسنے / سنجیدگی سے سننے / لطف اندوز ہونے)

ج) اساتذہ کرام.................. مشاعروں کے لیے شاگرد تیار کرتے تھے۔ (طرحی / آزاد / پابند)

د) مصنف کے زمانے سے پہلے زمانہ میں مشاعروں کا ماحول.................. ہوا کرتا تھا۔
(سنجیدہ / مزاحیہ / طنزیہ)

ہ) سنجیدہ مشاعروں کا رواج.................. ہورہا ہے۔ (ختم / زیادہ / کم)

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق وسباق بھی لکھیں۔

''ایک وہ زمانہ تھا جب.................. وہاں کشاں کشاں لے جاتا تھا''۔

۶۔ سبق ''کہنے کی باتیں'' کا مرکزی خیال تحریر کریں۔

۷۔ سبق ''کہنے کی باتیں'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۸۔ پچھلے زمانے اور موجودہ زمانے کے مشاعروں کا تقابلی جائزہ لیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے دفتری احکام، یادداشتیں، نکاح نامہ کے فارم وغیرہ پُر کروائیں۔

۲۔ عدالتی فیصلے، وکالت نامے اور قانونی تشریحات سمجھ کر پڑھوائیں۔

۳۔ سائنسی اور تکنیکی، پیشہ ورانہ تحریریں سمجھ کر پڑھوائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو طرحی غزل سے آگاہ کریں۔

۲۔ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوبِ نثر سے آگاہ کریں۔

۳۔ اُردو مضمون نویسی میں مولانا صلاح الدین احمد کے مقام پر لیکچر دیں۔

احمد ندیم قاسمی (بہ حیثیت نثر نگار)

(حالاتِ زندگی)

احمد ندیم قاسمی کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ آپ ۱۹۱۶ء میں خوشاب کے گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پیر غلام نبی بہت بڑے مبلغِ اسلام تھے۔ ندیم نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں والد کے انتقال کے بعد اپنے چچا پیر حیدر شاہ کے پاس کیمبل پور (اٹک) چلے گئے۔ جہاں سے عربی، فارسی اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔

پہلے محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر تعینات ہوئے۔ مگر جلد ہی دل اُکتا گیا۔ اور استعفیٰ دے کر لاہور آ گئے۔ جہاں رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' اور رسالہ ''پھول'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مابعد روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ آخری عمر میں مجلس ترقیِ ادب کے چیئرمین اور رسالہ ''فنون'' کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔

آپ کے افسانوں کے مجموعے چوپال، بگولے، طلوع و غروب، سیلاب و گرداب، آنچل، آبلے، آس پاس، در و دیوار، سناٹا، بازارِ حیات، گھر سے گھر تک اور کپاس کا پھول زیادہ مشہور ہیں۔

۱۹۷۴ء میں ''مجلس ترقیِ ادب لاہور'' کے ناظم اور ۱۹۷۶ء میں بزمِ اقبال کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۷ء میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کے لیے نظر بند کر دیے گئے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ''تمغۂ حُسن کارکردگی'' اور ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا۔

احمد ندیم قاسمی ادبائے اُردو میں منفرد حیثیت کے ادیب ہیں۔ وہ بہ یک وقت ایڈیٹر، نقاد، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے افسانہ نگاری میں کئی نئے تجربے کیے۔ اور نئے موضوعات پر منفرد انداز میں افسانے لکھے ہیں۔ ان کا بنیادی موضوع اپنے گرد و پیش کی معاشرتی زندگی اور اُس کے طبقاتی تضادات ہیں۔ وہ مختلف طبقات کے تصادم کا ذکر نہایت خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

اُن کے افسانوں کی زبان موضوع کی طرح سادہ اور دل کش ہے۔ جو دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ اِسی زبان میں ادبی حسن بھی ہے اور بانکپن بھی۔ اُن کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی خوبصورت تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ اُنہوں نے دیہاتی زندگی کے مختلف مسائل اور تہذیبی حالات پر کھل کر لکھا ہے۔ دیہاتی زندگی کی تصویرکشی کے ساتھ اُنہوں نے شہری زندگی کی سجاوٹ، بناوٹ، تصنع اور تکلفات کے بارے میں بھی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔

آپ نے ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو وفات پائی۔

سفارش

(احمد ندیم قاسمی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو ہمارے معاشرے میں موجود مختلف معاشرتی رویوں سے آگاہ کرنا۔
۲۔ اردو ادب میں افسانوی روایت سے واقفیت دلانا۔
۳۔ ادب میں فکشن کی اہمیت بتانا۔
۴۔ اُردو افسانوی ادب میں احمد ندیم قاسمی کے مقام کے بارے میں بتانا۔
۵۔ لغوی اور اصطلاحی معانی میں امتیاز کرانا۔
۶۔ بنیادی اسالیب نثر سے روشناس کرانا۔

خاص الفاظ و تراکیب تانگہ جوڑنا ۔ بھول پن ۔ چھینٹا پڑنا ۔ پٹس پڑنا ۔ چوڑے چکلے ۔ چیخ چاخ
جتن کرنا ۔ زن ۔ کوچوان ۔ چھپر

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا ''بھئی فیکے تانگا کہاں ہے؟ تانگا لاؤنا''۔

''تانگا تو بابو جی، آج نہیں جوڑا ہے''۔ فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے فیکے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''بابو جی ایک کام ہے''۔

''ہاں ہاں کہو'' میں نے کہا۔

''کام یہ ہے بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟'' فیکا بولا۔ ''اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے''۔

''اوہو۔ مجھے دکھ ہوا۔ کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟''

''جی نہیں''۔ فیکے کے چہرے پر بھول پن کا ایک اور چھینٹا پڑ گیا۔

''لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے

پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے اللہ رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کی قسم کھا کر کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اُس نے ''لقمان حکیم؛ حکمت کا بادشاہ'' پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے اب تک آنکھ لگی ہو تو اپنے باپ کا نہیں۔ بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اُٹھا لاؤں؟''

اس وقت فیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ ''تم بھی حد کرتے ہو فیکے۔ اب آگے بھی کہو نا''۔

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی۔ وہ بولا۔ ''بس بابو جی اللہ آپ کا بھلا کرے رات تو چیخ چاخ کے گزار دی پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے بچا رشیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں ابالو اور اس پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ اُبال کر باندھو، باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی بابو جی۔ اسے ایک ہسپتال میں لے گئے، پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہ تھی۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو ہسپتال میں چوکیدار ہے۔ اُس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برآمدے میں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی اِدھر نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھیے ہاتھ باندھتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہہ دیجیے کہ صدیقے مریض کو ذرا سا دیکھ لے''۔

مین نے کہا ''وہاں ایک ڈاکٹر ہے، ڈاکٹر عبدالجبار۔ اُن سے میرا سلام کہو۔ کام ہو جائے گا، نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اِس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے، نام یاد کرلو ڈاکٹر عبدالجبار''۔

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی تانگا مل گیا۔ جب تانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ہسپتال کے ایک چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتا پوچھ رہا ہوگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہہ دوں مگر اب تانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکا یک جبار صاحب کا سکوٹر میرے تانگے کے قریب سے زن سے گزر گیا۔ جبار صاحب! میں چلایا۔ مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں، میں نے سوچا، کل کہہ دوں گا۔ کل پہلا کام بھی یہی کروں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلا لیں۔

میں نے سوچا، اس وقت کون بلائے۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کر لوں گا، اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہوگی صبح ہی کو ہو گی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

"یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا؟" میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

"جی ہاں" وہ بولا "مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا۔ دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں"۔

"اور اس کی آنکھ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو چلی گئی بابو جی" فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا۔ "جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتال میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہو گا روپیہ بھی ضائع ہو گا"۔

فیکا بولا۔ "بابو جی کیا پتا آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولھا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتا کوئی چنگاری سلگ رہی ہو"۔

میں اس بات سے چونکا۔ آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا۔ "بابو جی، ذرا سا میرے ساتھ چلے چلیے"۔

میرے جسم میں نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا؛ شیو کرنا تھا چائے پینی تھی؛ میں نے کہا؛ "میں تمہیں اپنا کارڈ دے دیتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر جبار کو دکھا دو۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیں گے۔ تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے۔ پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا"۔

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہے۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ "جبار صاحب! اس کا کام کر دیجیے، بے چارا بڑا ہی غریب آدمی ہے دعائیں دے گا" اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام کو اُس نے مجھے بتایا کہ "جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی"۔

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہوگئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا۔ مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آنکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔ ''کیوں فیکے، جبار صاحب نے کام کردیا نا؟''

وہ بولا۔ ''مگر بابو جی، وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں''۔

میں نے فوراً کہا۔ ''میں نے انہیں فون کردیا تھا''۔

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اُٹھی۔ ''جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے، کہ دیکھو، بڈھے کو تکلیف نہ ہو''۔

پھر میں وہاں سے چلا گیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے؛ مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جارہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دور کردی۔ مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا ''آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب اُنھوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی۔ آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا۔ دو روپے کُل ہوگئے۔ کچھ ہو سکے تو کیجیے''۔

میں نے کہا: ''میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں''۔

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہوگئی۔ پانچ چھے روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں چُرا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں، مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''بابو جی، سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا''۔

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ ''واپس آگیا نا تمھارا بابا؟''

فیکا بولا۔ ''واپس بھی آگیا اور آپریشن بھی ہوگیا۔ جمعہ کو پٹی کھل رہی ہے۔ دعا کیجیے''۔

میں نے کہا۔ ''اللہ رحم کرے گا''۔

پھر وہ جمعہ کی شام کو آیا۔ تو بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ ''بابو جی غضب ہوگیا پٹی کھلی تو پتا چلا۔ ایک آنکھ تو گئی ہی تھی، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے آپریشن کا زخم مِلے تو دوسرا آپریشن ہوگا۔ اور دوسری آنکھ کا بھی ہوگا''۔

میں نے اُسے تسلی دی اور اُسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوئے تو انہیں گھر م

جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔

اِدھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو اڑھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آکر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟''

''جی ہاں''۔ نوکر بولا۔ ''بس میرے منہ سے نکل گیا''۔

''بڑے احمق آدمی ہو''۔ میں نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ ''جاؤ کہہ دو کپڑے بدل رہے ہیں۔ آتے ہیں''۔

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ کی بھی بات نہیں۔ دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اِس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اُسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ بابو جی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا.......... اس کی آواز بھرا گئی۔

میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ بہ مشکل میں نے کہا۔ ''فیکے! بات یہ ہے فیکے کہ؛ بات یہ ہے''۔

آنسوؤں سے بھیگا ہوا، بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لیے فیکا اٹھا، اور بولا ''بابو جی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں؟ میرا بابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اُسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی۔ قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا''۔

اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں فیکے۔ کوئی بات نہیں''۔

(کپاس کا پھول)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) فیکا کوچوان کیوں پریشان تھا؟

ب) فیکے کوچوان نے کس بات سے مصنف کو متاثر کیا؟

ج) فیکا کوچوان کیوں زار و قطار رونے لگا؟

د) مصنف کی شخصیت کو آپ نے کیسا پایا؟

ہ) اگر آپ، مصنف کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

و) فیکا کوچوان کے والد کی آنکھ کس طرح ٹھیک ہوگئی؟

۲۔ سبق کے متن کے مطابق دُرست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) سبق ''سفارش'' ادبی صنف کے لحاظ سے ہے۔

i) داستان ii) ڈراما

iii) افسانہ iv) انشائیہ

ب) فیکے کوچوان کے والد کی آنکھ کی بینائی چلے جانے کی وجہ تھی۔

i) سُرمہ لگانا ii) بروقت علاج نہ کرنا

iii) پوست کے ڈوڈے کا پانی ڈالنا iv) سُرمہ نہ لگانا

ج) مصنف فیکے کوچوان کا سامنا نہیں کر پا رہے تھے۔

i) جھوٹ بولنے کی وجہ سے ii) سفارش نہ کرنے کی وجہ سے

iii) پیسے نہ دینے کی وجہ سے iv) اِن میں سے کوئی بھی نہیں

د) نرس بوڑھے مریض کی طرف خصوصی توجہ دے رہی تھی۔

i) سفارش کی وجہ سے ii) رشوت دینے کی وجہ سے

iii) بڑھاپے کی وجہ سے iv) ان میں سے کوئی بھی نہیں

ہ) مصنف نے نوکر کو ڈانٹا کیوں کہ اُس نے

i) فیکے کی بے عزتی کی ii) مصنف کی موجودگی کا بتایا

iii) فیکے سے ہمدردی کا اظہار کیا iv) بینائی کی وجہ سے

۳۔ سبق کے متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) مریض کا سفارش کی بنیاد پر علاج ہوا۔

ب) مصنف نے کوچوان کی بھرپور مدد کی۔

ج) مریض کو ہسپتال کے برآمدے میں چوکیدار کی سفارش پر جگہ مل گئی۔

د) مریض سخت گرمی میں ہسپتال میں داخل ہوا۔

ہ) مصنف کو آخر میں سخت احساسِ ندامت ہوا۔

۴۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''فیکا بولا کیا پتا آنکھ کے کسی کونے .... ذرا سا میرے ساتھ چلے چلیے''۔

۵۔ سبق ''سفارش'' کا تنقیدی جائزہ لیں۔

۶۔ سبق ''سفارش'' ہمارے کن معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتا ہے؟

۷۔ سبق ''سفارش'' کی روشنی میں مصنف اور فیکا کوچوان کی شخصیت کا ایک دوسرے سے موازنہ کریں۔

۸۔ درج ذیل جملوں کی مختصر وضاحت کریں۔

الف) لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ۔

ب) کوئی بات نہیں، فیکے کوئی بات نہیں۔

ج) چولہا بجھ جاتا ہے تو دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔

د) میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں فرق کرائیں۔

۲۔ طلبہ کو بنیادی اسالیب بیان سے آگاہی دیں۔

۳۔ احمد ندیم قاسمی کا کوئی اور افسانہ کمرہ جماعت میں سنوائیں۔

۴۔ طلبہ کی لائبریری میں کسی اور افسانہ نگار کے افسانوی مجموعہ کے انتخاب میں مدد دیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو ''سفارش'' کی روشنی میں معاشرے میں موجود رویوں سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو اُردو میں افسانہ نویسی کی روایت بتائی جائے۔

۳۔ اُردو ادب میں افسانہ نویسی کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

سعادت حسن منٹو

(حالاتِ زندگی)

سعادت حسن منٹو سمرالہ ضلع لدھیانہ میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر امرتسر واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ لاہور کے رسالوں میں کام کیا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ بعدازاں بمبئی میں متعدد فلمی رسالوں کی ادارت کی۔ اور فلمی کہانیاں لکھیں۔ اِن کی تخلیقی صلاحیتوں کو بمبئی کا ماحول بہت راس آیا۔ چناں چہ اِن کے بیش تر افسانے اُسی دور کی تخلیق ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد لاہور آ کر مستقل طور پر رہنے لگے۔ منٹو کا شمار اُردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کے یہاں عمدہ فنی نمونے ملتے ہیں۔ اُنہوں نے بعض فرسودہ موضوعات پر خاص انداز اور جزئیات نگاری سے نہایت موثر کہانیاں پیش کی ہیں۔ انہوں نے افسانے کی زبان کو تکلف سے آزاد کیا۔ اُن کے مکالموں میں بے تکلفی کے علاوہ کبھی کبھی بازاری زبان کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مگر وہ اپنی اِس غیر روایتی زبان میں احساس کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ بعض نقاد منٹو کو مغربی افسانہ نگاروں کا خوشہ چیں کہتے ہیں۔ لیکن اِس رائے سے بہت سے نقاد متفق نہیں ہیں۔

اُن کا پہلا افسانہ ''تماشا'' ہے اور آخری ''کبوتر کبوتری'' ہے۔ اس کے علاوہ منٹو کے افسانے گنجے فرشتے، یزید، نمرود کی خدائی، خالی بوتلیں خالی ڈبے، نور جہاں سرورِ جہاں، بادشاہت کا خاتمہ، سرکنڈوں کے پیچھے، منٹو کے مضامین، جنازے، کروٹ، تلخ ترش شریں، اوپر نیچے، پھندے، تین عورتیں، لاؤڈ اسپیکر، سڑک کے کنارے، سیاہ حاشیے، آتش پارے، بغیر عنوان کے، سرگزشتِ امیر اور گورکی کے افسانے وغیرہ ان کے قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے لاہور میں وفات پائی۔

جی آیا صاحب

(سعادت حسن منٹو)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو افسانے کے ذریعے معاشرے میں موجود طبقاتی فرق سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طلبہ کو کسی ادبی یا علمی تحریر میں فنی وفکری تجزیہ کر کے اپنی رائے دینے کے لیے تیار کرنا۔
۳۔ طلبہ کو سعادت حسن منٹو کے نثری خوبیوں سے واقفیت دلانا۔
۴۔ اُردو افسانے میں جاری رجحان سے آگاہی دینا۔

خاص الفاظ وتراکیب

قمقمہ ۔ ہیبت ناک ۔ کیتلی ۔ انڈیلنا ۔ غیر مرئی طاقت ۔ نیند کا غلبہ ۔ ڈکار
چراغِ گور ۔ سرخ دَھار ۔ طومار

باورچی خانے کی دُھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قُمقمہ چراغِ گور کی مانند اپنی سُرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں ہوئی دیواریں ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں ابھر ابھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا...... دُور کونے میں پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا...... یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے تھے؛ جو اس کی زباں سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

''جی آیا صاحب! جی آیا صاحب!......بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب''۔

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد اُنہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا۔ اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام...... یہ کیونکر ممکن تھا؟

برقی چولھا بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابلِ مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی؛ اور ''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب'' گنگناتا ہوا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن اس لڑکے کو ایک غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے روزانہ ایک ہی

واقعہ دیکھ کر قطروں کی صورت میں آنسوٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قمقمہ حیرت سے اُس لڑکے کی طرف ......دیکھ رہا تھا......
کمرے کی فضا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

''قاسم......قاسم!''۔

''جی آیا صاحب!'' لڑکا جو انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔''بیوقوف کے بچے! آج پھر یہاں صُراحی اور گلاس رکھنا بُھول گیا ہے۔

''ابھی لایا صاحب......ابھی لایا صاحب''۔

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اس کمرے سے آواز آئی۔

''قاسم......قاسم!''

''جی آیا صاحب'' قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

''بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے...... جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگتے ہوئے جاؤ......سخت پیاس لگ رہی ہے''۔

قاسم بھاگا ہوا گیا۔ پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ سوڈے کی بوتل لے آیا۔ اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دی۔

''اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو، برتن صاف نہیں ہوئے کیا''؟

''ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب''۔

''اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ......''

قاسم کو''ورنہ'' کے بعد کا جُملہ بہ خوبی معلوم تھا''بہت اچھا صاحب''۔

کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں واپس چلا گیا۔ برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔

اب نینداس کی آنکھوں میں سمٹی چلی جا رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اُتر رہا تھا...... یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی۔ اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب''۔

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا۔ کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ ''بھاڑ میں جائیں برتن۔ اور چولھے میں جائیں بوٹ...... کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں۔ اور پھر چند لمحات آرام کرنے کے بعد......''

اس خیال کو باغیانہ تصور کرتے ہوئے قاسم نے ترک کر دیا۔ اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی۔ تو اُس کے جی میں آیا کہ اُبلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے۔ اور اس طرح غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے...... مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا۔

بہ صد مشکل منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب وہ آرام سے سو سکتا تھا۔ اور نیند...... وہ نیند، جس کے لیے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھایا۔ اور لیٹ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے آرام دہ بازوؤں میں تھام لے۔ اس کے کان ''بوٹ، بوٹ'' کی آوازوں سے گونج اٹھے۔

''بہت اچھا صاحب...... ابھی پالش کرتا ہوں''۔ بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر سے اُٹھا۔ جیسے اس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کے لیے حکم دیا ہے۔

ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا۔ کہ نیند کے غلبے نے اسے وہیں پر سُلا دیا۔

سورج کی خونیں کرنیں اس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں...... قاسم کی کتابِ حیات میں ایک اور پُر از مشقت باب کا اضافہ ہو گیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا۔ تو اسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا ''یہ سُور کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہے۔ اور مجھے خیال تھا؛ کہ اس نے بوٹ صاف کر لیے ہوں گے...... نمک حرام!...... ابے قاسم''۔

''جی آیا صاحب''۔

قاسم کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا۔ کہ اُس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا بُرش دیکھا۔ فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں سو گیا تھا صاحب! مگر...... مگر بوٹ ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب......''

یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی جلدی بوٹ کو بُرش سے رگڑنا شروع کر دیا۔

بوٹ پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر تہہ کیا۔ اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

''قاسم''

''جی آیا صاحب''

''قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے۔ اس لیے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا...... فرش بھی دُھلا ہونا چاہیے اس کے علاوہ تمہیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا...... سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیے''۔

''بہت بہتر صاحب''۔

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ اس کے گرد و پیش برتن ہی برتن پڑے ہیں۔ اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے۔ جس سے وہ راکھ اڑ اڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکا یک اس ظلمت میں ایک سُرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں خون آشام برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی...... فضا خوشی کے قہقہوں سے معمور ہو گئی۔

قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس وحشت ناک خواب سے بیدار ہو کر جی ''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب''۔ کہتا ہوا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ اب اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنا شروع ہوئی۔ جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا۔ جو ان سب لڑکوں کو نگل گیا...... قاسم نے خیال کیا۔ کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا...... قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چناں چہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کردیا۔ کہ اسے یکا یک خیال آیا۔ ''آج مہمان آرہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے۔ اور یہ نیند کم بخت کتنی ستارہی ہے...... مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہوسکے گا......''

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا۔ کہ اچانک اسے قلم دان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا...... وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا۔ کہ بہت تیز ہے۔

چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہوگئے...... "چاقو...... تیز دھار چاقو!...... یہی تمہاری مصیبت کو ختم کرسکتا ہے"۔

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو کو اٹھا کر اپنی انگلی پر پھیرلیا...... اب وہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا۔ اور نیند...... پیاری، پیاری نیند اب اسے با آسانی نصیب ہوسکتی تھی۔

انگلی سے خون کی سُرخ دھار بہہ رہی تھی...... سامنے والی دوات کی سرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم خون کی دھار کو مسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور منہ میں یہ گنگنا رہا تھا۔ ''نیند، نیند...... پیاری نیند''۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانے میں بیٹھی سلائی کررہی تھی۔ اور اپنی زخمی انگلی دکھا کر کہنے لگا...... ''دیکھیے بی بی جی......''

''ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟...... کم بخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے؟''

''بی بی جی...... بس میز صاف کررہا تھا۔ اور اس نے کاٹ کھایا'' قاسم ہنس پڑا۔

''ابے سُور اَب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں،...... مگر اب بتا تو سہی، آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں آگیا۔ اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کردیا۔

''اب اِس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے...... ضرور صاف کرنے ہوں گے...... کیوں میاں مٹھو؟ قاسم نے انتہائی مسرت میں کھڑکی میں لٹکے ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں صاف کرنے والے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا...... انسپکٹر صاحب قاسم کی زخمی انگلی دیکھ کر بہت برسے۔ اور جی کھول کر گالیاں دیں۔ مگر اسے مجبور نہ کرسکے...... شاید اس لیے کہ ایک بار اُن کی اپنی انگلی میں قلم تراش کی نوک چُبھ جانے سے بہت درد محسوس ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بُھلا دی۔ اور قاسم کودتا پھاندتا ہوا اپنے بستر میں جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن

صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا...... اب پھر وہی مصیبت نمودار ہوگئی۔

''قاسم...... صاحب کی جرابیں اور قمیص دھو ڈالو''۔

''بہت اچھا بی بی جی''۔

''قاسم اس کمرے کا فرش کتنا بدنما ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کرو...... دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے......''۔

''بہت اچھا صاحب''۔

''قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انہیں نمک سے صاف کرو''۔

''جی اچھا صاحب''۔

''قاسم! طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے۔ اسے صاف کیوں نہیں کرتے''؟

''ابھی کرتا ہوں بی بی جی''۔

''قاسم! ابھی خاکروب آتا ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا۔ وہ سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا''۔

''بہت اچھا صاحب''۔

''قاسم! ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا''۔

''ابھی چلا بی بی جی''۔

پانچ چھ روز اسی قسم کے احکام سننے میں گزر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا۔ ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ اور پھر علی الصبح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لیے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لیے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھے۔ اور ایک لمحے کے بعد اس کی انگلی سے خون بہہ رہا تھا...... انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چناں چہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر وہ اپنی ایجادہ ترکیب کی خوشی میں مگن تھا...... ایک وقت کی روٹی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی سا زخم آ گیا۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی...... یہ سودا کچھ برا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہوگیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار شروع تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گزر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا، کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کر لے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا تھا اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب اسے ہر وقت باورچی خانے میں موجود رہنا پڑتا۔ کبھی مرچیں پیستا۔ کبھی آٹا گوندھتا

کبھی کوئلوں کو جلا دیتا۔ غرض صبح سے لیکر آدھی رات تک اس کے کانوں میں ''ابے قاسم یہ کر، ابے قاسم وہ کر'' کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا...... قاسم کی ننھی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا؟

ایک روز اس کے آقا نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا۔ جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک انگلی میں دور تک چلی گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی۔ کہ خون نکلنا بند ہو جائے۔ مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ وہ نہ تھما...... سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔

''بی بی جی، میری انگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے''۔

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا۔ فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چُپ چاپ اُٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی اُنگلی پر باندھ دیا۔ اور کہا۔ ''قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے''۔

''وہ کیوں بی بی جی؟''

''یہ صاحب سے دریافت کرنا''۔

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور بھی سفید ہو گیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سُن کر فوراً اپنے پاس بلایا۔

کیوں میاں یہ انگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں؟''

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

''تم نوکر یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جا سکتا ہے...... اپنا بستر بوریا دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں...... سمجھے''۔

''مگر...... مگر صاحب''۔

''صاحب کا بچہ...... بھاگ جا یہاں سے۔ تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا...... اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا......''

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اس سے کچھ کہا اور اپنا بستر اُٹھا کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ مگر دفعتاً کچھ خیال آیا اور بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔ اور درد انگیز آواز میں اتنا کہہ کہ ''سلام بی بی جی...... میں ہمیشہ کے لیے آپ سے رُخصت ہو رہا ہوں''۔ وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔

ان میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا...... "زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے...... ہاتھ کاٹنا پڑے گا"۔

"بہت بہتر"۔

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اس مریض کا نام درج کر لیا...... ایک چوبی تختے پر چارپائی کے سرہانے لٹکا ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

نام۔ محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن (مرحوم)

عمر۔ دس سال۔

(منٹو راما)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) "جی آیا صاحب" کے الفاظ لڑکے کی زبان سے کسی کوشش کے بغیر کیوں نکل رہے تھے؟

ب) لڑکا بار بار اپنی اُنگلی کیوں زخمی کر لیتا تھا؟

ج) انسپکٹر نے لڑکے کو نوکری سے کیوں نکال دیا؟

د) قاسم کون سا منظر دیکھ کر گھبرا گیا؟

ہ) قاسم کس چیز سے تنگ آ گیا؟

و) قاسم نے کون سا خواب دیکھا؟

۲۔ سبق کے متن کے مطابق دُرست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) انسپکٹر صاحب ایک انسان تھے۔

i) نرم دل　　ii) ظالم

iii) سخی　　iv) کنجوس

ب) افسانہ "جی آیا صاحب" کا مرکزی کردار ہے۔

i) قاسم　　ii) انسپکٹر

iii) انسپکٹر کی بیوی　　iv) خود مصنف

ج) افسانہ "جی آیا صاحب" عکاسی کرتا ہے۔

i) معاشرتی تفریق کی　　ii) طبقاتی تفریق کی

iii) مذہبی تفریق کی　　iv) لسانی تفریق کی

د) باورچی خانے کی روشنی گُل کرنے کے بعد قاسم کے کان آوازوں سے گونج اُٹھے۔

i) ''قاسم......قاسم'' ii) ''بوٹ بوٹ''

iii) جی آیا صاحب۔ جی آیا صاحب iv) ''چاقو......تیز دھار چاقو''

ہ) قاسم کی عمر تھی۔

i) آٹھ سال ii) نو سال

iii) دس سال iv) گیارہ سال

۳۔ افسانہ ''جی آیا صاحب'' پڑھنے کے بعد آپ کس نتیجے پر پہنچے؟

۴۔ اگر آپ انسپکٹر کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

۵۔ افسانہ ''جی آیا صاحب'' ہماری کن معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتا ہے؟

۶۔ انسپکٹر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیں؟

۷۔ افسانہ ''جی آیا صاحب'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں؟

۸۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''تھوڑی دیر کے بعد اس کی .... قاسم سر سے پیر تک لرز گیا''۔

۹۔ درج ذیل تشبیہات کی مختصر وضاحت کریں۔

الف) چراغِ گور کی مانند ب) ہیبت ناک دیو کی طرح ج) خون آشام برچھیوں کی طرح

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو کوئی کہانی / مکالمہ کی جزئیات سُنا کر اُن کی استعداد کے مطابق کی بیشی کروائیں۔

۲۔ کوئی کہانی / مکالمہ درمیان سے سُنا کر طلبہ سے اس کی سیاق و سباق بیان کروائیں۔

۳۔ سعادت حسن منٹو کے چند اور افسانے بھی سنوائے جائیں۔

۴۔ سعادت حسن منٹو کے افسانے ''جی آیا صاحب'' کا کسی اور افسانہ نگار کے افسانے سے موازنہ کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو افسانہ ''جی آیا صاحب'' کے ذریعے ہمارے معاشرے میں موجود طبقاتی فرق سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو ہمارے معاشرے میں موجود انسانی رویوں کے بارے میں بتائیں۔

۳۔ اُردو افسانوی ادب میں سعادت حسن منٹو کے مقام سے آگاہ کریں۔

۴۔ اُردو افسانے میں جاری رجحان سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

غلام عباس

(حالاتِ زندگی)

غلام عباس ۱۹۰۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انٹر اور علومِ شرقیہ کے امتحانات لاہور سے پاس کیے۔ پندرہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ بچوں کے لیے بھی چند کتابیں لکھیں۔ پھر رسالہ ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے اور ریڈیو پاکستان کے رسالے ''آہنگ'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

پریم چند کے بعد اُردو کے گِنے چُنے افسانہ نگاروں میں غلام عباس کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کا افسانہ ''آنندی'' اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا مواد اِس ماحول سے لیتے ہیں جس ماحول سے شب و روز اُن کو سروکار رہتا ہے۔ وہ موضوعات کے انتخاب میں ہر قسم کے تعصب سے بالاتر رہتے ہیں۔

اُن کے افسانوں کی زبان نہایت سادہ اور رواں ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بڑی روانی کے ساتھ اُس بات کو ادا کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں تصنع اور بناوٹ نہیں پائی جاتی۔ اُن کا اسلوب مختصر نویسی کے اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بے جا تفصیلات سے گریز کرتے ہیں۔ صرف مقصد کی بات کہتے ہیں۔ اور باقی باتیں چھوڑ دیتے ہیں۔

غلام عباس کے افسانوں کی ایک نمایاں خوبی اُن کا طنزیہ انداز ہے۔ وہ معاشرے کے اُن پہلوؤں پر بھرپور وار کرتے ہیں؛ جن کو تہذیب و تمدن کی کھوکھلی چمک دمک اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی بنا پر متوسط طبقے کے لوگوں نے اپنے لیے سرمایہ حیات بنا رکھا ہے۔

اُن کا اسلوب حقیقت پسندانہ ہے۔ اُن کے ہاں رومانی عناصر نہیں ملتے۔ اُن کے نزدیک زندگی ہنسی، کھیل اور تمسخر کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے۔ اُن کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں ایک یا دو یا چند کرداروں کو نہیں بلکہ پورے شہر کو ایک مجسم کردار کی صورت میں رچتا بستا اور جیتا جاگتا دکھاتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ اُن کے افسانے ندرتِ موضوع کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام ہوئے ہیں۔ اُن کے بیش تر افسانوں کے موضوعات منفرد ہیں۔

آپ نے بہت کم افسانے لکھے؛ مگر ادبی اور فنی نقطہ نظر سے اُن کا ہر ایک افسانہ شاہکار ہے۔ اُن کے افسانے آنندی، جاڑے کی چاندنی، کن رس، الحمرا کے افسانے اور ناول دھنک، گوندنی والا تکیہ زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں لاہور میں وفات پائی۔

کتبہ

(غلام عباس)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو صنف افسانہ کے خدو خال بتانا۔
۲۔ اُردو ادب میں افسانے کے تدریجی ارتقا سے آگاہی دینا۔
۳۔ غلام عباس کے اسلوبِ تحریر سے واقفیت دلانا۔
۴۔ طلبہ سے عبارت میں معاون فعل کی تلاش کرانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: پھلواریوں ۔ چوڑی چکلی ۔ تلوے ۔ رکھوالی ۔ مادری زبان ۔ وضع قطع
سنگ تراش ۔ رہنمائی کا جویا ۔ قبضہ جمانا

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواروں ہی میں محدود رہتی ہے۔ مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے۔ ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہالایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، درختوں کے سایے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے، مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جُھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں پانی پڑا تھا، بخارات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو مہینے کے شروع کے صرف پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی اُن ہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھالی تھیں اور اُوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی، گھر میں کچھ اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری

رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ، ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، غرض ادنیٰ اعلیٰ ہر درجے اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کی نکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگ دار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے۔ ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس اُمید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے، ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں اُن کا کوئی حل سوچا جائے۔ مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کے کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض من چلے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز ٹوپی ہاتھ میں۔ کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تربتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے۔ اس گرمی میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گو اِن میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر لب ولہجہ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اُکساتی تھی بل کے یہ کہ انہیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مَسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اُتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیش تر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آ گیا تھا اور کند اُستروں سے متواتر داڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور تھوڑی پر بالوں کی جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بہ خوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑ چڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں تھا۔

ایک تانگے کی سواری میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر

کے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ شریف حسین نے اکنی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کی بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کی چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُرلطف تماشا تھا۔ شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والوں سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اُتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر کرتا، اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی، مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو اُن کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا اُن کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گل دان، ٹیبل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیڑیاں، چوکھٹے، گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھیک، بدھ کا نیم قد مجسمہ............

ایک دکان پر اس کی نظر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اُکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا، قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے کیا دیجیے گا؟

وہ رُک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا دام اس قدر کم بتاؤ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکاندار کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

''ہم تو ایک روپیہ دیں گے''۔ یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

''اجی سنیے تو۔ کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں............ اچھا لے جائیے''۔

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اُٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودا منسوخ کر

دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے یہ نہیں تم کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعیِ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آچکا تھا۔ مگر اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے اس کے خیالوں میں ہلچل مچا دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے دفتر جاتے دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بڑی چابک دستی سے اُس پر اِس کا نام کندہ کر کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی خوش نما بیلیں بنا دیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کُھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اُس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اخبار کو اُتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اس کو لپیٹ دیا تھا اور اُس پر ایک نظر اور ڈال لے۔ مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا، شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کے کتبے کو دیکھ کر اُس کے اُن خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اُس نے اخبار اُتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دل کش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ جیب سے چابی نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے، جس

کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اُسی بے کواڑ الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے پر پڑتی۔ اُمیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتیں۔ افسر کی ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا، نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا۔ رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آجاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا۔ مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اُسی بے کواڑ الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اُس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہوگئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ الماری تک بہ خوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ نہ گرا دے اسے وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس کے صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چناں چہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبے کو بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے، بے بال کے برش، بے کار صابن دانیاں رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نہیں ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اُس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اُٹھانی پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اُس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری، پرانی

کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اوّل کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اُسے یہ عہدہ ملا اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر کاٹھ کی پیٹی سے کتبے کو نکالا صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر لٹکا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیوں کہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دو گنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا اُن کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا اس کا دل بُجھ جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے۔

ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے...... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے......

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اُس کلرک نے چھٹی کی میعاد بڑھوائی اور نہ ہی بیمار پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے حامل تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اُسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ بدتر معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا، نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اُسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا، سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جمالیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چوں کہ میز کے ہلنے سے کتبے کے گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصہ میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ الماری میں، تو کبھی میز پر، کبھی صندوقوں کے اوپر، تو کبھی چارپائی کے نیچے، ایک دفعہ کسی نے اُٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی، دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ اُٹھا کر دھویا، پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اُس جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ

پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس برس گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیال چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات آہ، دم بھر میں اُن تصورات کو اُڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش، یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب ملا کر کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بہ خوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کر دیا اور وہ زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اُسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اُٹھا، گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے وہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا۔ اس نے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سے ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(جزیرہ سخنوراں)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) کلرک غیر زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کیوں کرتے تھے؟

ب) کلرک نے کتبہ کتنے میں خریدا؟

ج) درجہ اوّل کی جگہ شریف حسین کو کیوں کر ملی؟

د) کلرک نے سنگ تراش سے کتبہ پر کیا لکھوایا؟

ہ) باپ کی موت کے بعد بیٹے نے کتبے کا کیا کِیا؟

و) کلرک نے گھر جا کر کتبہ کہاں رکھا؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) کلرک کے بیٹے تھے:

i) ایک ii) دو

iii) تین iv) چار

ب) پیشے کے لحاظ سے شریف حسین تھا:

i) اُستاد ii) کلرک

iii) افسر iv) چپڑاسی

ج) کلرک نے دفتر سے شہر تک سفر کیا:

i) بس میں ii) ٹرین میں

iii) تانگے میں iv) رکشہ میں

د) کلرک رہتا تھا:

i) سرکاری مکان میں ii) ذاتی مکان میں

iii) کرایے کے مکان میں iv) ہوٹل میں

سبق ''کتبہ'' صنف ادب کے لحاظ سے ہے:

i) داستان　　ii) ناول

iii) ڈراما　　iv) افسانہ

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) کلرک دفتر سے کافی دیر بعد نکلا۔

ب) کلرک نے دفتر سے شہر تک رکشے میں سفر کیا۔

ج) شریف حسین سرکاری دفتر میں درجہ دوم کا کلرک تھا۔

د) کلرک پچپن برس کی عمر میں پنشن ہوا۔

ہ) کلرک نے تین ماہ تک عارضی طور پر درجہ اوّل کلرک کے طور پر کام کیا۔

و) کلرک کے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادی سادگی سے ہوئی۔

۴۔ متن کے مطابق درست الفاظ سے خالی جگہیں پُر کریں۔

الف) کلرک کا بڑا بیٹا ریل کے .... میں کام کرتا تھا۔

(گودام ۔ دفتر ۔ بکنگ آفس میں)

ب) کلرک نے .... سے کتبہ پر اپنا نام کندہ کرایا۔

(سنگ تراش ۔ پینٹر ۔ ڈیزائنر)

ج) کلرک نے کتبہ .... روپیہ میں خریدا۔

(ایک ۔ دو ۔ تین)

د) شریف حسین سرکاری دفتر میں .... کلرک تھا۔

(درجہ اوّل ۔ درجہ دوم ۔ درجہ سوم)

۵۔ سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل کی وضاحت کیجیے۔

الف) مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اُسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اُسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

ب) سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا..... ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

ج) اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا۔

د) تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اُسے اپنی حالت پہلے سے بھی بدتر معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا۔ مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

د) افسر کی ایک نگاہِ کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

۶۔ چند کلرک ہر روز فائلیں ساتھ گھر کیوں لے جاتے تھے اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا تھا؟

۷۔ مصنف نے مختلف کلرکوں کی جو وضع قطع بیان کی ہے۔ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۸۔ اس سبق کا خلاصہ تحریر کریں۔

عبارت میں معاون یا امدادی افعال کا استعمال

معاون یا امدادی افعال وہ افعال ہیں۔ جو دو جملوں سے مرکب ہوتے ہیں۔ دو فعل مل کر ایک مرکب فعل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ وہ افعال جو دوسرے افعال کے معاون ہوتے ہیں۔ اور اُن کے ملنے سے کلام میں خوبی، لطافت اور زورِ حسن پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اصل فعل کو اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے امدادی یا معاون فعل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے افعال کو معاون یا امدادی افعال کہتے ہیں۔ مثلاً ہم کرکٹ کھیل چکے ہیں۔ اُس نے خط لکھ دیا ہے وغیرہ۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے عبارت میں معاون فعل تلاش کروائیں۔
۲۔ کسی بھی ادب بارے میں صنائع لفظی ومعنوی کی پہچان کروائیں۔
۳۔ غلام عباس کے دو اور افسانے کمرہ جماعت میں سنوائے جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو ادب میں افسانے کے خدوخال سے آگاہ کریں۔
۲۔ اُردو میں افسانے کے تدریجی ارتقا پر لیکچر دیں۔
۳۔ غلام عباس کا طرزِ تحریر بتائیں۔
۴۔ اُردو افسانوی ادب میں غلام عباس کا مقام بتائیں۔

اشفاق احمد

(حالاتِ زندگی)

اشفاق احمد ۱۹۲۵ء میں مکتسر ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتسر ہی میں حاصل کی۔ فیروز پور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو کیا۔ روم یونیورسٹی اور گرے نوبلے یونیورسٹی فرانس سے اطالوی و فرانسیسی زبانوں کے ڈپلومے لیے۔ نیویارک یونیورسٹی میں براڈ کاسٹنگ کی خصوصی تربیت حاصل کی۔ دو سال تک دیال سنگھ کالج لاہور میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں روم یونیورسٹی میں اُردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ساتھ ہی ریڈیو روم سے پاکستان کے لیے اُردو پروگرام نشر کرتے رہے۔

دو سال بعد روم سے واپس آکر ریڈیو پاکستان لاہور میں ملازمت اختیار کی۔ مگر کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر اپنا رسالہ ''داستان گو'' جاری کیا۔ ''داستان گو'' بند ہونے کے بعد ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مابعد ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھنے لگے۔ آخری عمر میں ''مرکزی اردو بورڈ'' کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اور وفات تک اسی ادارے کے سربراہ رہے۔

اشفاق احمد نے قیامِ پاکستان کے بعد افسانے لکھنے شروع کیے۔ اور نہایت ہی اعلیٰ افسانے لکھ کر صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئے۔ اُنھوں نے اُردو کا لازوال افسانہ ''گڈریا'' لکھ کر شہرتِ دوام حاصل کی۔ اشفاق احمد افسانہ نگار کے علاوہ ڈراما نگار بھی ہیں۔ اُنھوں نے ریڈیو، اسٹیج اور ٹیلی ویژن کے لیے بے شمار ڈرامے لکھ کر عوام میں مقبولیت کی سند حاصل کی۔ لاہور ریڈیو اسٹیشن سے اُن کا مزاحیہ ڈراما ''تلقین شاہ'' عرصہ دراز تک نشر ہوتا رہا۔

اشفاق کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اُن کی زبان ہمیشہ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ جس میں شگفتگی، برجستگی اور بے ساختگی بدرجہ اُتم موجود ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے چٹیلے اور تیز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی تحریروں میں تشبیہات بھی موجود ہوتی ہیں۔ جو بیان کو خوبصورت اور دلچسپ بناتی ہیں۔

پنجابی زبان لکھنے میں بھی اشفاق کو قدرت حاصل ہے۔ ٹاہلی تھلے، اُچے برج لہور دے۔ اُن کے سلسلہ وار ٹیلی ویژن ڈرامے مشہور ہوئے۔ اشفاق بہترین مزاح نگار بھی ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ پھر اُس کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھرپور مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں لاہور میں وفات پائی۔

چور

(اشفاق احمد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو صنف افسانہ کی مدد سے روزمرہ کے سماجی مسائل سے آگاہ کرنا۔
۲۔ کسی بھی ادبی فن پارے کے مرکزی خیال اور اہم نکات بتانا۔
۳۔ اخبارات و رسائل کے کسی بھی متن پر اجمالی تبصرہ کرنا سکھانا۔
۴۔ اشفاق احمد کے اُسلوبِ تحریر سے واقفیت دلانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

ہالا ۔ السی ۔ سرمئی اندھیرا ۔ کنگن ۔ کھری چارپائی ۔ آنکھیں ڈبڈبانا
جائے وقوعہ ۔ نمازِ کفارہ ۔ پستہ قد ۔ قوتِ مدافعت

جب اس نے اندر کوٹھڑی میں پہنچ کر دروازہ بند کیا تو اس کا دل ذرا سا گھبرایا، لیکن پھر اس نے جی کڑا کر کے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکالی اور روپیہ بھر روشنی کا ہالا فرش پر چھوڑ دیا۔ کمرے میں دھیمی سی روشنی ہوئی اور اُس نے آگے بڑھ کر الماری کا پٹ کھولا۔

الماری دواؤں کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی اور اُس کے بیچ کے خانے میں چھوٹے سے آئینے کے پاس کنگھی اور سُرمے دانی پڑی تھی۔ اس نے اوپر اور نیچے کے خانوں میں روشنی کا روپیہ پھینکا۔ لیکن وہاں سوائے دواؤں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ لکڑی کی تِلے دانی میں اُون کی ایک گچھی، کانچ کی چوڑیوں کے چند جوڑے، سر پر لگانے کی پنّیں اور بجلی کے ایک بل کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

تِلے دانی سیاہ شیشم کی تھی اور اس کا بوجھ کافی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی سیٹ، الماری کے تختے پر ٹھیک نہ بیٹھی تھی۔ اس نے تِلے دانی کو احتیاط سے اُٹھا کر کھولا اور نیچے اُسے ململ کے استر والا رجسٹری کا لفافہ دکھائی دیا۔ لفافہ دوہرا تہ کیا ہوا تھا اور اس کے پھٹے ہوئے کونوں سے ململ کے دھاگے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی صفائی سے وہ لفافہ اُٹھایا اور ٹارچ دانتوں میں دبا کر اُسے کھولا۔ اندر نئے نئے تہ شدہ نوٹ پڑے تھے۔ اُس نے لفافے کو ناک کے قریب لا کر سونگھا تازہ نوٹوں سے بروزہ اور السی کے تیل کی خوشبو آ رہی تھی۔

اُس نے لفافہ اپنی جیب میں رکھا، ایک ایک سلائی دونوں آنکھوں میں سرمے کی ڈالی اور ہولے ہولے قدم اُٹھاتا باہر صحن میں نکل کر جدھر سے آیا تھا اُدھر سے باہر نکل گیا۔

دور کہیں کوئی کُتا بھونکا اور اُس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کا دل تھوڑی سی مدت میں اتنی بڑی کامیابی پر بڑا مسرور تھا اور وہ دل ہی دل میں سیٹی بجاتا ہوا اپنی راہ چلا جا رہا تھا کہ اچانک اُسے سُرمئی اندھیرے میں سڑک کے آخری کنارے پر جن دکھائی

دیا۔ اس کا سر آسمان میں تھا اور ٹانگیں زمین پر۔ چور کے قدم وہیں رُک گئے۔ وہ جن آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اُس کا خون رگوں میں خشک ہو رہا تھا اپنے آپ کو اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لیے اس نے سورۃ الناس کی تلاوت شروع کر دی تو جن بتیسی نکال کر زور سے ہنسا۔ نارنجی رنگ کا ایک شعلہ لپکا اور دو مضبوط کھمبوں پر واپڈا کے ٹرانسفارمر کا فیوز اُڑ گیا۔

جب چور نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین جلا کر لفافہ کھولا تو اس میں سے سو کا ایک اور دس دس کے سات نوٹ برآمد ہوئے۔ ساتھ ہی نیلے رنگ کے کاغذ پر لکھا ہوا ایک خط بھی تھا۔

جناب بھائی صاحب!

لعنت ہو آپ کی دولت پر اور آپ کے روپے پر جو وقت پر غریب بھائی کے کام نہ آسکا۔ اس دنیا میں جس کا اور کوئی نہ ہو اُس کا اللہ ہوتا ہے۔ ہم نے کچھ چیزیں گھر کی بیچ کر ایک سو روپیہ بنا لیا ہے۔ پچاس روپے ان کے ایک دوست سے مل گئے ہیں اور بیس روپے دوسرے سے۔ اللہ نے چاہا تو اس رقم سے ہمارا بلّو بچ جائے گا۔ ملٹری کے ڈاکٹر نے ہمیں بلّو کے آپریشن کے لیے پنڈی بلا لیا ہے۔ اللہ اس کا بھلا کرے وہ مفت آپریشن کرے گا۔ آپ سے تو غیر اچھے ہیں۔ اب ہمیں آپ کی مدد کی بالکل ضرورت نہیں، معاف رکھیں اور جو روپیہ آپ ہمیں بھیجنا چاہتے تھے اس سے فریدہ کے کنگن بنوا دیں۔ ہم ایک سو ستر میں پورا ایک مہینہ پنڈی میں گزار سکتے ہیں۔ پرسوں سے اُن کی چھٹی شروع ہے اور ہم صبح کی لاری سے پنڈی پہنچ جائیں گے۔ اللہ آپ جیسے بھائیوں سے سب کو محفوظ رکھے۔ آمین

خاکسار۔ شکیلہ بیگم

یہ خط پڑھ کر چور کے دل پر ایک گھونسا سا لگا اور وہ بتی بُجھا کر اور اپنے کپڑے اتار کر کھرّی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ننگے چور نے اُٹھ کر کونے سے ٹھنڈی صُراحی کا پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس واقعے پر غور کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور دو سیاہ آنسو اُس کی کنپٹیوں سے پھسل کر بالوں میں جذب ہو گئے۔ اِسی پشیمانی کی حالت میں اسے نیند آگئی اور جب وہ جاگا تو صبح کے دس بج چکے تھے وہ خط اور روپے جیب میں ڈال کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

شکیلہ بیگم کے گھر کے سامنے شہتوت کے چھوٹے سے پیڑ تلے ایک اے۔ ایس۔ آئی۔ میز کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور دو سپاہی باری باری ایک سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ شکیلہ کا پست قد خاوند تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور تھانیدار پنسل سے کان کھجا رہا تھا، چور ان کے سامنے سے گزرا اور پیچھے نظر کیے بغیر سیدھا دوسری گلی میں چلا گیا۔ بڑی سڑک میں بس اسٹینڈ کے پاس اُس نے کھوکھے والے سے سگریٹ کی ایک ڈبیا خریدی، لیکن جیب میں صرف بندھے ہوئے ایک سو ستر روپے ہونے کی وجہ سے وہ ڈبیا اسے واپس کر دی۔

داتا دربار جا کر اس نے دو رکعت نمازِ کفارہ ادا کی۔ فوارے کا پانی اپنی سرمہ لگی آنکھوں پر پھیرا اور مزار کی طرف منہ کر کے اُلٹا چلتا ہوا جوتوں والے کے پاس پہنچ گیا۔ جوتے پہن کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں پر انگلیاں پھیرتا رہا پھر اس نے ہاتھ باندھ کر کہا ''بابا جی معاف کرنا اس وقت ہاتھ خالی ہے''۔

جوتوں والے نے ہاتھ کے اشارے اور تیوری کے چڑھاؤ سے کہا ''جا جا دفع ہو جا'' وہاں سے دفع ہو کر وہ سیدھا اپنے دوست کے پاس پہنچا اور اس سے دو روپے اُدھار لے کر لنڈے چلا آیا۔ یہاں آٹھ آنے کی اُس نے روٹی کھائی۔ ایک روپیہ بیٹھک میں جا کر ہار دیا اور باقی آٹھ آنے تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں فقیروں کو بانٹ دیے۔

رات کے وقت جب وہ شکیلہ کے گھر کے سامنے سے گزرا تو وہاں اندر کی بتی روشن تھی۔ اس نے چاہا کہ رجسٹری کا لفافہ اندر اُچھال دے۔ لیکن پھر اسے حوصلہ نہ ہوا اور وہ جی کڑا کر کے گھر کے آگے سے گزر گیا۔

رات بھر چور اپنے ضمیر کے ساتھ جھگڑتا رہا؛ لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ صبح اس نے اپنے ضمیر کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ مسجد کے ستاوے میں ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد وہ سیدھا شکیلہ بیگم کے گھر پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹا کر جیب میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا اِرادہ تھا کہ جونہی کوئی دروازہ کھولے گا'' وہ رجسٹری والا لفافہ اس کے قدموں میں پھینک کر ہوا ہو جائے گا اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرے گا۔

دروازہ کھلا اس کے سامنے شکیلہ بیگم کا پستہ قد خاوند کھڑا تھا۔ چور نے اپنی جیب سے لفافہ کھینچ کر جب پستہ قد آدمی کے سامنے مُٹھی کھولی تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ پورا کھول کر کہا ''میرا نام محمود علی ہے اور مجھے قریشی صاحب سے ملنا ہے''۔

شکیلہ کے خاوند نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ''معاف کیجیے یہاں کوئی قریشی صاحب نہیں رہتے''۔

چور نے کا ''یہ مکان نمبر ۳۶۷ نہیں کیا؟ جی نہیں شکیلہ بیگم کے خاوند نے معذرت بھرے لہجے میں کہا: ''یہ مکان نمبر ۳۷۶ ہے''۔

''اوہ معاف کیجیے گا''۔ چور نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے سامنے پھیلایا اور مصافحہ کر کے اطمینان سے چل دیا۔

راستے میں اس کے ضمیر نے اُسے پھر لعنت ملامت کرنا شروع کر دی۔ چور نے چائے والے کی دکان پر بیٹھ کر ضمیر کو سمجھایا کہ اس نے ایمانداری سے روپیہ واپس کر دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ہاتھ اور اس کی انگلیوں نے ساتھ ہی نہیں دیا وہ کیا کرتا؛

اپنے ضمیر کے ساتھ تین دن اور تین راتیں جھگڑا کرنے کے بعد چور کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی اسے اپنے اندر کے چور پر رہ رہ غصہ آ رہا تھا اور وہ اپنی توجہ کسی اور طرف لگانا چاہتا تھا۔ چناں چہ اس نے ایک شام جیل روڈ کے ایک

سرونٹ کواٹر سے ٹرانسسٹر ریڈیو چُرایا اور لنڈے جا کر بیچ آیا۔ پینتالیس روپے اس کے تین چار دن گزارنے کے لیے کافی تھے اور وہ تین چار دن گزارنے کے لیے لاہور چھوڑ کر قصور چلا گیا۔

قصور میں حضرت بُلھے شاہ کے قُرب میں رہ کر اسے بڑا سکون ملا، لیکن اس کے ضمیر کو یہاں بھی آسودگی میسر نہ آئی۔ ہر شام مسجد میں سونے سے پیش تر اس کا ضمیر اس سے ایک ہی سوال پوچھتا کہ اگر تم اس روپے کو اپنی اس طرح حق حلال کی کمائی سمجھتے ہو جیسی تم نے ٹرانسسٹر ریڈیو سے حاصل کی ہے تو پھر اسے خرچ کیوں نہیں کرتے ہو، جیب میں کیوں لیے لیے پھرتے ہو۔ چور اس کا ایک ہی جواب دیتا کہ ابھی مجھے اس کے خرچے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس لیے نہیں خرچ کرتا۔ جوں ہی ضرورت پڑے گی خرچ کر لوں گا۔ لیکن اُس کا دل اِس جواب سے مطمئن نہ ہوتا تھا اور اسے کچا سا جواب سمجھتا تھا۔

چور حیران بھی تھا اور ناخوش بھی۔ اُسے یہ چوری بہت مہنگی پڑی تھی۔ نہ کام آتی تھی نہ جان چھوڑتی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شکیلہ بیگم کا خط پھاڑ ڈالے جوان روپوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ چناں چہ اس نے ایک شام باہر کھیتوں میں ریل کی پٹڑی پر بیٹھ کر وہ خط پھاڑ کر اس کے پرزے ہوا میں اُڑا دیے۔

رات جس وقت وہ سونے کے لیے مسجد کی صف پر لیٹا تو اس کا ضمیر پھر اسے لعنت ملامت کرنے لگا۔

چور ایک ہفتہ قصور میں گزارنے کے بعد پھر لاہور پہنچ گیا۔ مزنگ چونگی پر لاری سے اُترتے ہی وہ سیدھا شکیلہ بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس نے راستے میں رجسٹری والا لفافہ ایک نالی میں پھینک دیا۔ ایک سو ستر کے نوٹ احتیاط سے جیب میں ڈال لیے۔ جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو اندر سے ایک بچے کا جنازہ باہر نکل رہا تھا۔ اس کا ایک پایہ پست قد آدمی کے کندھے پر تھا اور وہ زار زار رو رہا تھا۔ چور نے آگے بڑھ کر پست قد آدمی کی جگہ کندھا دیا اور پھر اس سے ایک دوسرے آدمی نے کندھا بدل لیا۔

ایک سفید ریش بزرگ شکیلہ بیگم کے خاوند کو بغل میں لے کر چل رہا تھا اور اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ ایک اور نوجوان جو غم نصیب کے دفتر کا ساتھی معلوم ہوتا تھا کہہ رہا تھا۔ ''ملٹری اسپتال سے آپریشن کا بلاوا بھی آ گیا۔ کرنل صاحب نے وعدہ بھی کر لیا تھا مفت آپریشن کا اور یہ کوئی نیا آپریشن بھی نہیں ہوتا۔ بس ذرا دِل کی نالی میں انگلی ڈال کر اسے کھولنا ہوتا ہے۔ معمولی آپریشن ہے جی۔ لیکن اگر وقت زیادہ گزر جائے تو بس پھر یہی ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم''۔

شکیلہ کا خاوند دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور دو تین آدمی مل کر چور کو برا بھلا کہنے لگے۔ جس نے سفر خرچ کی ساری رقم چُرا لی تھی۔

چور کے ضمیر نے جیسے اُس کی گدّی میں زور کا دھپا مارا اور وہ زانوں کے بل سڑک پر گرا۔ دو آدمیوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور اس کے چھلے ہوئے زانوں پر ہاتھ پھیرا۔ شکیلہ کے خاوند نے چور کو تشکر اور محبت بھری نظروں سے

دیکھا اور جنازہ میانی صاحب پہنچ گیا۔

جب بچے کو دفنا کر سب لوگ چلے گئے تو چور بڑی دیر تک قبرستان کی دیوار پر بیٹھا رہا اور جب شام کافی گہری ہوگئی تو وہ آہستہ سے اُٹھا اور اس نے پھولوں سے بھرا ہوا ایک چھابا بارہ روپے میں خرید کر اور سقے کو ساتھ لے کر تازہ بنی ہوئی قبر پر پہنچ گیا۔ جب سقہ اُس کی مرضی کے مطابق قبر کو تر بتر کر چکا تو اس نے تین روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اور جب چور قبرستان سے باہر نکلا تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے باقی کے ایک سو بچپن میں سے دس کا نوٹ اور نکالا اور کھوکھے والے سے بولا ''ایک ڈبی کیپسٹن، چار پان'' ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے چور کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور شکر کرنے لگا کہ اِس ایک نیک کام سے اس کے ضمیر کا بوجھ بالکل ختم ہو گیا۔

(سفر مینا)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیں۔

الف) قصور جا کر چور کو کیسے سکون ملا؟

ب) چور کی قوتِ مدافعت کیوں جواب دے گئی؟

ج) چور نے کب محسوس کیا کہ اُس کے ضمیر کا بوجھ اُتر گیا؟

د) چور نے نوٹوں کا لفافہ اس کے مالک کو واپس کیوں نہیں کیا؟

ہ) چور کو راستے میں جو جن نظر آیا وہ دراصل کیا تھا؟

و) شکیلہ کا خط پڑھنے کے بعد چور کی ذہنی کیفیت بیان کریں۔

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) سبق ''چور'' کا بنیادی طور پر موضوع ہے:

i) نفسیاتی
ii) اخلاقی
iii) جنسی
iv) سیاسی

ب) شکیلہ بیگم کے بیٹے کی موت واقع ہوئی:

i) حادثے سے
ii) بروقت علاج نہ ہونے سے
iii) دریا میں ڈوبنے سے
iv) آسمانی بجلی گرنے سے

ج) چور نے ٹرانسسٹر ریڈیو کہاں سے چرایا؟

i) دوکان سے
ii) دفتر سے
iii) سرونٹ کوارٹر سے
iv) ہوٹل سے

د) چور نے قبرستان میں سقّے کو دیے:

i) دو روپے
ii) ایک تین روپے
iii) چار روپے
iv) پانچ روپے

ہ) افسانہ ''چور'' اشفاق احمد کی کتاب میں شامل ہے:

i) میرے افسانے
ii) ایک محبت سو افسانے
iii) سفر مینا
iv) بند گلی

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) سرمہ دانی سیاہ شیشم کی تھی۔
ب) لفافے سے سو کا ایک اور دس دس کے سات نوٹ برآمد ہوئے۔
ج) چور کو حضرت بُلھے شاہ کے مزار پر سکون میسر نہیں آیا۔
د) داتا دربار جا کر چور نے دو رکعت نمازِ کفارہ ادا کی۔
ہ) چور نے قصور میں ایک دن گزارا۔
و) پستہ قد شخص شکیلہ بیگم کا خاوند تھا۔

۴۔ متن کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

الف) چور ایک..............قصور میں گزارنے کے بعد پھر لاہور پہنچ گیا۔
ب) شکیلہ بیگم کے گھر کے اندر کی..............روشن تھی۔
ج) راستے میں چور کے ضمیر نے اسے پھر..............کرنا شروع کر دی۔
د) چور نے..............والی دکان پر بیٹھ کر اپنے ضمیر کو سمجھایا۔
ہ) ایک سفید ریش بزرگ شکیلہ بیگم کے خاوند کو..............میں لے کر چل رہا تھا۔
و) شکیلہ کا..............دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
ز) چور نے پھولوں سے بھرا ہوا ایک چھابا..............روپے میں خریدا۔

۵۔ اپنی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ بیان کیجیے جب آپ کو کوئی نیک کام کر کے بڑی خوشی ہوئی ہو؟

٦۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق وسباق بھی لکھیں۔

''یہ خط پڑھ کر چور کے دل میں ایک گھونسا سا لگا.................. وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا''۔

۷۔ افسانہ ''چور'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۸۔ افسانہ ''چور'' نے آپ کو کس طرح متاثر کیا، اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے اخبارات و رسائل کے کسی بھی متن پر جامع مگر مختصر تبصرہ لکھوائیں۔

۲۔ نصابی کتب کے علاوہ عمومی معلومات پر مبنی رسائل اور کتب کا مطالعہ کروائیں۔

۳۔ کمرہ جماعت میں اشفاق احمد کا کوئی اور افسانہ سنائیں۔

اشارات سبق

۱۔ طلبہ کو صنف افسانہ کی مدد سے روزمرہ کے سماجی مسائل سے آگاہ کریں۔

۲۔ کسی بھی ادبی فن پارے کا مرکزی خیال سمجھنے کا طریقہ بتادیں۔

۳۔ اُردو افسانہ نگاری میں اشفاق احمد کا مقام بتائیں۔

۴۔ اشفاق احمد کے اسلوبِ تحریر پر لیکچر دیں۔

شوکت صدیقی

(حالات زندگی)

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار شوکت صدیقی ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ میں الطاف حسین صدیقی کے ہاں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ میں تیرہ پارے حفظ کیے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ بعد میں بی۔اے اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۰ء میں پہلے لاہور آئے؛ پھر کراچی آکر صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور روزنامہ انجام اور روزنامہ مساوات کے مدیر رہے۔اس کے علاوہ متعدد دیگر اخبارات میں کام کیا۔ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے وابستہ رہے۔

شوکت صدیقی نے زندگی کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہ عوام میں رہتے تھے اس لیے انہیں عوام کے دکھ درد کا بہ خوبی علم تھا۔ان کے ناولوں اور افسانوں میں معاشرتی مسائل کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اُن کے اندازِ نگارش میں بے حد سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

اُن کی تحریروں میں بے ساختگی، نرمی، روانی اور سلاست جیسی صفات بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جذبے کی سچائی، صاف گوئی اور خلوص اُن کی تحریر کی نمایاں خوبی ہے۔ وہ ادب میں مقصدیت کے قائل تھے۔اُن کی تحریروں میں کوئی نہ کوئی مقصد اور اصلاح کا پہلو ضرور موجود ہوتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں جملے چھوٹے اور بامعنی ہوتے ہیں۔ان کی بندش نہایت چست اور دل کش ہوتی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں حکومت پاکستان نے ادبی خدمات کے صلے میں انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔

شوکت صدیقی کی تحریروں میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کی خوش بیانی کی وجہ سے ان کا طنز بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ اُس میں تیز کاٹ نہیں ہوتی۔ وہ زبان کے لطف، واقعات اور محاورے کے استعمال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان کی شگفتگی، گھلاوٹ اور مزاحیہ رنگ سے ان کی تحریر میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے ۲۰۰۶ء میں کراچی میں وفات پائی۔

شریف آدمی

(شوکت صدیقی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو افسانے میں بیان کردہ مختلف سماجی مسائل سے واقفیت دلانا۔
۲۔ کسی بھی ادبی فن پارے میں مقصدیت سے روشناس کروانا۔
۳۔ شوکت صدیقی کے اسلوبِ نثر اور فنِ تکنیک سے آگاہ کرنا۔
۴۔ اُردو افسانوی ادب میں شوکت صدیقی کا مقام بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

انگڑائی لینا ۔ کسل مندی ۔ گوراچٹا ۔ وضع قطع۔ کھیسیں ۔ تاؤ آنا ۔ جھجک محسوس کرنا
لقمہ دینا ۔ دن کٹنا ۔ مضمحل ۔ منہ بسورنا ۔ برتن مانجھنا

دوسرے روز وہ بستر پر پڑا دن چڑھے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ باہر صحن میں تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے رضائی کو ایک طرف پھینکا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ لیکن اِس مہینے کے ہر روز کی طرح، آج بھی اُس کے لیے دن کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا، اس کی بیوی دالان میں ایک طرف سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ تینوں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صبح ہی صبح وہ باہر میدان میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ اس نے سوچا اِس وقت بیوی سے بات کرنا مناسب نہیں، اِس لیے یہی بہتر ہے کہ پہلے وہ بچوں کو بلا کر گھر میں لے آئے اور جب ذرا چہل پہل ہو جائے تو پھر کوئی بات چیت کی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ بیوی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کو دونوں کی نظریں ملیں؛ مگر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

دروازے ہی پر اس کو ڈپٹی صاحب کا ڈرائیور مل گیا۔ اس وقت وہ گہرے نیلے رنگ کی اُونی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ڈرائیوروں والی ٹوپی تھی۔ ڈرائیور کوئٹہ کا گوراچٹا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا جسم، چہرے پر تازہ خون کی دَمک، وردی پہن کر وہ بڑا شان دار نظر آ رہا تھا اور اُس کے سامنے وہ خود کسی کیڑے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے اُس کو دیکھتے ہی اپنی بھاری آواز میں کہا:

''ماسٹر جی! السلام علیکم!''

وہ حقیر کیڑے سے ایک بارگی، باعزت آدمی بن گیا۔ اس نے لہجے میں ضرورت سے زیادہ شفقت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا، ''وعلیکم السلام۔ کہو میاں، گھر میں سب خیریت ہے۔ بال بچے اچھی طرح ہیں۔''

وہ کہنے لگا: ''سب اللہ کا شکر ہے، ماسٹر جی۔''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اس کو ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وہ ناشتے سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈرائیور تیز تیز قدم اٹھاتا ڈپٹی صاحب کے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا اُس کو میدان کے اُس سرے تک دیکھتا رہا؛ جہاں بہت سے بچے ہجوم کی صورت میں چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے اور ان سے ذرا فاصلے پر انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک آدمی کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سارا ہنگامہ کا ہے کا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اِسی اثنا میں اس کو سامنے سے بجلی گھر کا مستری آتا ہوا نظر آیا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا، جب مستری قریب آ گیا تو اس نے پوچھا:

''یہ بچے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں۔''

وہ کہنے لگا، ''میں بھی یہی دیکھنے گیا تھا۔ وہ جو کیمرہ لیے صاحب کھڑا ہے وہ بچوں کے سامنے چاکلیٹ، ٹافیاں اور پیسے پھینک رہا ہے اور جب بچے ان کو اٹھانے کے لیے جھپٹتے ہیں تو وہ جلدی سے ان کا فوٹو کھینچ لیتا ہے۔''

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا، ''فوٹو کھینچ لیتا ہے! کیوں؟''

مستری نے اس کی حیرت کو اہمیت نہ دیتے ہوئے جواب دیا، ''پتہ نہیں۔ نہ جانے کیسا آدمی ہے، جب بچے اس کے قریب آ جاتے ہیں تو ان کو ڈانٹ کر دور کر دیتا ہے اور جب وہ چلّاتے ہیں تو کھیسیں نکال کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ میں نے بچوں کے برابر کھڑے ہو کر سوچا تھا کہ لاؤ ایک فوٹو کھینچوا ڈالوں تو اُس نے انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دے کر مجھ کو الگ ہٹا دیا۔''

اُس نے جھٹ سے کہا، ''اور تم نے گالی سن لی۔''

وہ بولا، ''ہاں جی اور کیا کرتا؟''

ماسٹر جی کو، جو تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے تھے، مستری کی اس بے حسی پر بڑا تاؤ آیا۔ اُن کا جی چاہا کہ وہ ابھی جا کر اُس کو اِس بُری طرح جھاڑیں کہ اُس کو بھی معلوم ہو جائے کہ اِس محلے میں مستری کی طرح سب بے حس ہی نہیں رہتے ہیں بلکہ کچھ شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ مستری جیسے اِس بات کو تاڑ گیا تھا۔ اُس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ کہنے لگا:

''اچھا ہوا۔ اِس وقت آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میں کئی روز سے آپ کی تلاش میں تھا۔''

اُس نے گھبرا کر کہا، ''کیوں، خیریت تو ہے؟''

مستری آہستہ سے بولا، ''بات یہ ہے کہ......!'' کہتے کہتے وہ رُک گیا جیسے وہ اپنی بات کہنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے اس جھجھک کو محسوس کرتے ہوئے فوراً سہارا دیا۔

''ہاں، ہاں کہو کیا بات ہے؟''

مستری کہنے لگا، ''بات یہ ہے کہ میری بیوی پچھلے کچھ دنوں سے بڑی بیمار ہے۔ اِس کا تو آپ کو بھی پتہ ہوگا۔''

اُس نے فوراً لقمہ دیا، ''ہاں! سنا تو ہے کہ تمہارے گھر والی آج کل علیل ہے۔''

مستری بتانے لگا، ''اِس لیے کھانے پکانے کی بڑی تکلیف ہے۔ آج کل گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔ بچے الگ ستاتے ہیں۔ گھر والی کا حال یہ ہے کہ وہ تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوتی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے دن کٹ رہے ہیں۔''

اُنہوں نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا:

''بھئی تو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کرو۔ اِس طرح کیسے کام چلے گا۔''

مستری کہنے لگا، ''علاج تو اُس کا ہو رہا ہے۔ مگر اِس وقت سوال تو کھانے پینے کا اور گھر کی دیکھ بھال کا ہے۔'' اُس نے لمحہ بھر توقف کیا اور حرفِ مطلب پر آ گیا، ''میں نے سوچا آپ کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے۔ آپ کی گھر والی دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آ جاتی ہے۔ تو اِس سے ہم دونوں کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ہرج نہ ہو تو وہ میرے گھر کی ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں، کھانا تیار کر دیا کریں۔ کوئی زیادہ کام نہیں ہے۔ اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کر دیا کریں۔ دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ میں آپ کو ۲۰ روپے مہینہ دے دیا کروں گا اور اِس کے علاوہ......!'' مگر اُس نے بات پوری کرنے سے پہلے ٹوک دیا۔

''اور اس کے علاوہ پھٹا پرانا کپڑا دے دیا کروں گا۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا'' غصے اور جذبات کی شدت سے اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''مستری! اللہ نے ہم پر وقت ڈالا ہے تو تم بھی جو چاہو کہہ لو۔ اللہ اللہ! اب یہ وقت آ گیا ہے کہ ماسٹر فرزند علی کی بیوی، تمہارے گھر کے برتن مانجھے، ماما گیری کرے۔ واہ مستری واہ، خوب تم نے ہمدردی کی، خوب تم نے ہمسائے کا حق ادا کیا۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور مستری کے جواب کا انتظار کیے بغیر غصے سے کانپتے ہوئے اپنے گھر میں چلا گیا۔ مستری ہکا بکا ان کو کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

گھر میں جا کر ماسٹر فرزند علی نے دیکھا کہ بیوی اسی طرح دالان کے کونے میں سر جھکائے مضمحل بیٹھی تھی۔ وہ بے چینی سے کمرے کے اندر جا کر، دیوانے کتے کی طرح اِدھر اُدھر تیزی سے گھومتا رہا۔ پھر دالان میں آ گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

''میں نے کہا سن رہی ہو شبن کی اماں۔ آئندہ اس مستری کے بچے کے دروازے پر تم نے قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی

نہیں ہوگا۔ خبردار! جو اَب تم اُس کے گھر گئیں......، بچوڑا کہیں کا۔"

وہ پیچ وتاب کھاتا ہوا، پھر کمرے کی طرف چل دیا۔ بیوی نے ٹوک کر کہا،" کیوں آخر ہوا کیا؟" وہ رک کر کہنے لگا۔

"کچھ نہیں! کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے...... ابھی مجھ سے ملا تو کہنے لگا کہ تم اپنی بیوی کو میرے یہاں کھانا پکانے پر رکھ دو، حد ہوگئی......"

وہ بگڑ کر بولی، "اس کی ہمت کیسے ہوگئی۔ ابھی ابا جان سنیں تو یہی کہیں کہ پاکستان جا کر تم دونوں نے خاندان کا خوب نام روشن کیا۔ پیش کار صاحب کی بیٹی اب مستریوں کی خادمہ بنے گی۔ ان رذیلوں کی ٹہل چاکری کرے گی۔ خدا اس گھڑی کو موت نہ دے دے" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔ فرزند علی بھی اداس سا کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ گھر پر ایک سناٹا چھا گیا۔ دھوپ دیوار سے پھسل کر اب دالان تک آگئی تھی۔ اس میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ فرزند علی بے حد اداس بیٹھا تھا۔ باہر دالان سے ابھی تک اُس کی بیوی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ فضا اتنی بوجھل اور بے کیف تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ اچانک گھر کا دروازہ شور کرتا ہوا تیزی سے کھل گیا۔

اس کے تینوں بچے صحن میں آکر لڑ جھگڑ رہے تھے۔ چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے۔ گھر کا سناٹا شکست ہو چکا تھا اور زندگی کے ہنگامے اداس فضا سے نکل کر بیدار ہوگئے تھے۔ جب بچوں کا شور زیادہ بڑھ گیا تو وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر آگیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں لڑکے چھوٹی بچی کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کررہے تھے۔ بچی جھکی ہوئی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اُس نے اپنے ایک ہاتھ کو سینے سے چمٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دونوں بھائیوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی، جو بری طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ اب اُس کی بیوی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اُس نے ڈانٹ کر اُن کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر وہ اُن کے نزدیک چلی گئی۔ اُس نے دونوں کو زبردستی پکڑ کر الگ ہٹایا۔ بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں پر، بالوں پر، ہاتھ پیروں پر مٹی بھر گئی تھی۔ اُس نے اب رونا بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے خوشی سے ہنس کر اپنا ہاتھ نکالا اور بھائیوں کی طرف بڑھا کر کہا، "لو یہ رہی" اور اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ مگر اس کا ہاتھ خالی تھا۔ لمحہ بھر تک تو وہ اپنی ہتھیلی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر منہ بسور کر رونے لگی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ وہیں مٹی میں لوٹ گئی۔ دونوں لڑکے خوشی سے تالیاں بجا کر ناچنے لگے۔ "اچھا ہوا، لے، چلی گئی نا، اب تو ہم یہ بھی نہیں دیں گے۔" انہوں نے اپنی جیب کے اندر سے خوب صورت کاغذوں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ نکالی اور ماں کے پاس سے دور بھاگ گئے، ماں پوچھنے لگی۔

"ارے کم بختو! یہ تو بتاؤ، اُس کے ہاتھ میں تھا کیا؟"

ایک بچہ کہنے لگا، "چونی تھی، صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔ یہ اکیلی ہی اُس کو ہڑپ کر لینا چاہتی تھی، اب کھوگئی، اچھا

ہوا۔'' ماں نے جلدی سے کہا، ''تو وہ گئی کہاں؟'' اور پھر بچوں کی بات نظر انداز کر کے بچی کے پاس پہنچ گئی اور نظریں گڑا کر اِدھر اُدھر چونی تلاش کرنے لگی، ذرا دیر بعد بچی کے پاؤں تلے اُس کو مٹی میں دبی ہوئی چونی نظر آ گئی۔ اس نے چپکے سے اس کو اٹھا کر مٹھی میں دبالیا اور بچی کو اٹھا کر چمکارنے لگی، جو مٹی میں لتھڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ دروازے سے لگا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کل دن بھر کی بھوک جورات کے ہنگامے سے بجھ گئی تھی، پھر سلگنے لگی تھی۔ فرزند علی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے؟ باہر دالان میں بچوں کے چلانے اور اُس کی بیوی کے کوسنوں کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں سے بے نیاز، صرف ایک ہی آواز کو سن رہا تھا، بھوک، بھوک، بھوک جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح کھٹاک، کھٹاک، ہر ہر پل اور ہر ہر سیکنڈ کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اِسی لمحے اُس کی بیوی کمرے کے اندر آ گئی، ''لیجیے، یہ ذرا سے کچالو کھا کر پانی پی لیجیے، کچھ سہارا ہو جائے گا۔'' اُس نے گھوم کر دیکھا، بیوی کے ہاتھ میں رکابی تھی۔ جس میں اُبلے ہوئے آلوؤں کے تھوڑے سے قتلے تھے، جن پر نمک مرچ چھڑکا ہوا تھا۔ اُس نے بیوی سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ رکابی ہاتھ میں لے لی۔ بیوی باہر چلی گئی۔ اس نے آلو کا ایک قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، لیکن ابھی اُس نے چند ہی قتلے کھائے تھے کہ باہر آنگن میں اس کے خالہ زاد بھائی کی آواز سنائی دی۔ اُس نے رکابی اٹھا کر دیوار کے پاس ایک کونے میں چھپادی اور جلدی جلدی منہ پونچھنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ اندر آ گیا۔ فرزند علی دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت عرصے بعد آیا تھا۔ لہٰذا فرزند علی ہر ایک کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ آخر جب وہ اٹھ کر چلنے لگا تو فرزند علی نے اُس کو تکلفاً روکتے ہوئے کہا:

''بیٹھو میاں، چائے تو پیتے جاؤ۔''

شاید اُس کو ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنا تھیں۔ اِس لیے وہ ٹھہر گیا۔ فرزند علی نے اونچی آواز میں بیوی سے کہا، ''سن رہی ہو! تم نے سمیع کے لیے چائے تیار نہیں کی؟ کیا کہیں گے کہ بھائی کے یہاں گیا تھا۔ چائے تک کو نہ پوچھا۔'' اس نے خواہ مخواہ خوش مزاج بننے کی کوشش کی۔ اُس وقت دروازے کی آڑ سے اُس کی بیوی کا چہرہ نظر آیا وہ ناراضگی سے اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے گردن موڑ لی اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ آخر جب وہ پھر اٹھنے کا ارادہ کرنے لگا تو فرزند علی نے اُس کو روک کر کہا، ''چائے تو پیتے جاؤ! نہ معلوم اتنی دیر کیوں ہو گئی۔'' اور خود اٹھ کر باہر دالان میں آ گیا۔ بیوی کے قریب جا کر اُس نے کہا، ''چائے کا تو بندوبست کر دو۔ سمیع کو تو تم جانتی ہی ہو، خالہ سے جا کر کہے گا۔ صاحب! فرزند علی بھائی کے یہاں گیا تھا۔ ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔''

بیوی جل کر بولی، ''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بچی کی چونی لے کر تو آلو منگائے تھے۔ میرے پاس کچھ آپ نے جمع کرادیا ہے کہ چائے کا انتظام کردوں۔''

فرزند علی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا، پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا، ''مستری کے یہاں سے لے آؤ۔''

وہ حیرت سے بولی، ''مستری کے یہاں سے؟ آج ہی تو آپ نے منع کیا تھا۔ میں تو اس کے یہاں اب تھوکنے کی بھی نہیں۔'' وہ اس کو منانے لگا۔ ''سنو تو، کہنا، ہم جلد ہی تمہارا سارا قرض ادا کردیں گے اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں۔ مسلم اسکول کے سیکرٹری نے آج مجھے بلایا بھی ہے۔'' مگر وہ آمادہ نہ ہوئی۔

''وہ تو روز بلاتا ہے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔'' پھر اُس نے خوشامد کے سے انداز میں کہا، ''خدا کے لیے مجھ کو وہاں نہ بھیجیے۔ مجھے کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ پھر آج تو آپ سے اس کا جھگڑا بھی ہو گیا ہے۔''

فرزند علی خاموش ہو کر انگلی سے اپنے بالوں کو کریدنے لگا۔ اتنے میں سمیع نکل کر باہر دالان میں آ گیا کہنے لگا، ''نہیں بھائی صاحب آپ چائے کا تکلف نہ کیجیے، خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہوگی۔'' اور وہ روٹھا ہوا سا گھر سے باہر چلا گیا۔ فرزند علی نے اُس کو روکا بھی مگر وہ واپس نہ لوٹا۔ اُس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

فرزند علی جب پھر کمرے میں گیا تو اُس نے دیکھا کہ رکابی خالی پڑی تھی۔ اُس کی غیر حاضری میں بچوں نے اس کو صاف کر دیا تھا۔ غصے سے اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ بچوں کو اِس کا پہلے ہی علم تھا، اس لیے وہ گھر سے غائب ہو چکے تھے۔ اُس نے جھنجھلاہٹ میں رکابی اٹھا کر باہر آنگن میں پھینک دی اور اپنے ٹرنک کو کھول کر تمام کپڑے الٹ پلٹ کر رکھ دیے۔ پھر اُس نے سرج کی شیروانی نکالی۔ اُس کو پہنا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بیوی نے اس کو باہر جاتے ہوئے دیکھا، مگر شیروانی کو دیکھ کر اس کو تعجب ضرور ہوا۔ اس لیے کہ فرزند علی، اس شیروانی کو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا اور اس کو بڑی حفاظت کے ساتھ رکھتا تھا۔ جب کبھی وہ اس کو پہنتا تو بیوی کے سامنے اس طرح اِترا اِترا کر چلتا کہ اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہتا، ''دیکھو کیسا جچ رہا ہوں کیا ٹھاٹھ ہیں اپنے۔'' بلکہ ایک بار وہ اپنے اسکول کی کسی تقریب سے لوٹ کر آیا، تو بار بار اس کو ہنسی آ رہی تھی۔ بیوی نے پوچھا تو کہنے لگا، ''آج تو بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسکول کے جلسے میں جو بھی آتا، وہ مجھ کو ہیڈ ماسٹر سمجھتا، پہلے مجھ سے ہی بڑھ کر مصافحہ کرتا۔ ہیڈ ماسٹر جل بھن کر رہ گیا۔'' وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ شیروانی کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ مگر آج اِس شیروانی کو کیوں نکالا گیا۔ پھر اُسے خود ہی خیال آ گیا کہ مسلم اسکول کے سیکرٹری سے ملنے گئے ہوں گے اور اس احساس نے اس کو امید اور نا اُمیدی کے دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا۔

فرزند علی گھر سے نکل کر پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی دکان پر پہنچا۔ آنے کو تو وہ اس بازار میں آ گیا۔ مگر کسی

دکان میں داخل ہونے کی اُس کو ہمت نہ ہوئی۔ آخر وہ ایک دکان پر، جہاں بالکل سناٹا تھا، اللہ کا نام لے کر اندر چلا گیا۔ دکان میں الماریوں کے اندر ہینگروں پر، دیواروں پر ہر جگہ انگریزی وضع کے لباس ٹنگے تھے، بعض تو ایسے اعلیٰ درجے کے سلے ہوئے تھے کہ اس کو اپنی شیروانی بے حد گھٹیا معلوم ہونے لگی۔ دکان دار اُٹھ کر اُس کے پاس آیا۔

"کیا چاہیے؟" پر اس نے خود ہی کہا، "کوٹ دکھاؤں، کوئی سوٹ؟ ہمارے یاں جو نیا مال آیا ہے اُس میں تو ایسے ایسے کوٹ ہیں کہ نیا اس کے سامنے شرما جائے۔ خاص امریکہ کے تیار کیے ہوئے کپڑے ہیں۔"

فرزند علی نے جھجکتے ہوئے کہا، "آپ کے یہاں شیروانیاں نہیں ہوتیں؟"

دکان دار مسکرانے لگا، "نہیں صاحب! شیروانیاں کیسے ہوسکتی ہیں۔ یہ سب کپڑے تو امریکہ سے آئے ہیں۔"

فرزند علی کہنے لگا، "شیروانی اور اِس قسم کے کپڑے آپ اپنے یہاں سے خرید لیا کیجیے۔"

دکان دار اونچی آواز میں بولا:

"ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ امریکہ میں تو ہر سیزن میں کپڑے آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہر سال فیشن بدلتا ہے۔ نئے کے نئے کپڑے ایک دم کنڈم کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ دس دس سال ایک کپڑے کو رگڑتے ہیں۔ اب اِس اپنی شیروانی کو دیکھ لیجیے۔ سات آٹھ سال سے کم کی کیا بنی ہوگی۔ ایسے کپڑے لے کر دکان پر لگائے جائیں؛ تو آپ ہی بتائیے کون اِن کو خریدنے آئے گا؟" فرزند علی جل بھن کر رہ گیا۔ اپنی شیروانی کی وہ اس قدر ہتک برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اِسی اثنا میں دکان کے اندر ایک گاہک آ گیا۔ دکان دار اُسی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لہٰذا فرزند علی پیچ و تاب کھاتا ہوا دکان سے باہر آ گیا۔ کسی اور دکان پر جانے کی اُس کو ہمت نہ پڑی۔

شام کو جب لوٹا تو گھر میں اندھیرا پڑا تھا، بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ بیوی حسبِ معمول ان کو کوسنے دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ جا کر پلنگ پر بیٹھ گیا آخر تھوڑی دیر بعد بیوی نے آ کر پوچھا:

"سیکرٹری صاحب سے کچھ بات ہوئی۔"

وہ اُس کو مایوس نہ کرسکا، "پرسوں پھر بلایا ہے۔"

وہ بولی، "تو کچھ امید ہے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں" اس نے جھوٹ موٹ کی امید بندھوا دی۔

اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اُس نے شیروانی اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور مضمحل سا بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر تک بے چینی سے

دالان میں ٹہلتا رہا۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد، اُس نے کمرے میں آ کر شیروانی پہنی۔ بڑے لڑکے کو اٹھایا وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ کیروسین آئل کی بوتل اُس کو دی اور اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ بیوی نے خامشی سے سب کچھ دیکھا، مگر وہ کچھ بولی نہیں، چپ چاپ لیٹی رہی۔

باہر آ کر وہ سیدھا محلے کے پرچونیے کی دکان کی طرف چل دیا۔ سردی کی وجہ سے سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ دکان پر اُس وقت سوائے دکان دار کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ فرزند علی کہنے لگا:

''خان صاحب تم نے ابھی تک دکان نہیں بڑھائی۔''

وہ کہنے لگا، ''بس بند کرنے ہی جا رہا تھا۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔''

فرزند علی نے کہا، ''ہاں آج سردی زیادہ ہے، تمہارا کیا ہے بھائی، تم تو، سنا ہے کہ آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔'' وہ خواہ مخواہ اُس سے بے تکلفی برتنے لگا۔

''صحت بھی ماشاء اللہ ادھر اچھی ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خان صاحب تم پر تو پھر سے جوانی آ گئی ہے۔'' فرزند علی یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ دکان دار بھی مسکرا دیا۔

''ماسٹر جی، کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا پیٹ پال لیتا ہوں۔''

فرزند علی جھٹ سے بولا، ''ہاں بھئی تمہاری ہمت پر آفرین ہے۔ اکیلے دم پر اتنا بڑا ٹبر سنبھالے ہوئے ہو۔'' پھر اُس نے فوراً ہی بات کا رُخ بدل کر کہا، ''ذرا ایک بوتل مٹی کا تیل تو دینا'' اور لڑکے سے بوتل لے کر اُس کی طرف بڑھا دی۔ دکان دار نے بوتل میں تیل بھر دیا۔

فرزند علی نے بوتل لڑکے کو دے کر کہا، ''اچھا تم چلو۔ امی سے کہنا میں ابھی آتا ہوں۔'' لڑکا گھر کی طرف چل دیا۔ وہ دکان دار سے کہنے لگا، ''اِس کے پیسے کل آ جائیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ......'' دکان دار نے فوراً اُس کو ٹوک دیا۔

''ماسٹر جی، اِس طرح کام نہیں چلے گا۔''

وہ زبردستی ہنسنے لگا، ''اماں اس طرح بھی کام چلتا ہے۔'' اُس نے پھر بات بدلنے کی کوشش کی۔ ''ہاں تو......'' دکان دار نے پھر اس کو ٹوکا:

''نہیں جی! قرض میں نے بالکل بند کر دیا ہے۔ لڑکے کو بلا لیجیے۔'' اُس نے فرزند علی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر واپس بلا لیا۔ اس سے بوتل لی اور کنستر میں تیل انڈیل کر خالی بوتل اس کو تھما دی۔ بچہ سہما ہوا سا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزند علی جھینپ مٹانے لگا۔ ''خان صاحب! بعض وقت تم تو ایسی بے مروتی پر اتر آتے ہو کہ بالکل مارواڑی

معلوم ہونے لگتے ہو۔ اماں تمہارے پیسے لے کر یہاں سے بھاگنے سے تو رہا۔"

مگر خان صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر دکان بند کرنے کے واسطے قفل نکالنے لگا۔ فرزند علی ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دکان سے ہٹ آیا۔ لڑکے کو اُس نے گھر بھیج دیا اور خود دودھ والے کی دکان کی طرف چل دیا۔ اس لیے کہ گھر کے اندھیرے سے اُس کو وحشت ہو رہی تھی۔

دودھ والے کی دکان پر ایک دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی اور کئی آدمی بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ فرزند علی بھی وہاں پہنچ گیا، "کہو بھئی پہلوان کیا حال ہے؟"

وہ کہنے لگا، "ماسٹر صاحب سب خدا کا شکر ہے۔"

"ہاں میاں، ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرنا چاہیے وہ بڑی شان والا ہے۔"

دودھ والا اپنی بات کہہ کر فوراً کام میں مصروف ہو گیا۔ فرزند علی وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے کچھ دیر بعد اٹھ کر چل دیے۔ اب دکان پر سناٹا ہو گیا تھا۔ پہلوان کے علاوہ دکان میں سامنے پلنگ پر ایک شخص رضائی اوڑھے پڑا سو رہا تھا۔ ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر دکان دار کہنے لگا:

"ماسٹر صاحب، اب کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔"

وہ بولا، "ہاں بھئی، برکت رہے بھی تو کیسے؟ لوگوں کی اب وہ نیتیں نہیں رہیں۔ وہ ایمان نہیں رہے۔"

دکان دار کہنے لگا، "بالکل ٹھیک کہا آپ نے یہی حال ہو رہا ہے۔" پھر وہ دکان داری کے خراب ہونے کا رونا رونے لگا۔ "اب کیا بتاؤں آپ سے کہ کس طرح دکان داری چلتی ہے۔ لوگوں کو کھانے کو تو میسر نہیں۔ بے چارے دودھ کہاں سے پییں۔"

فرزند علی نے باتوں میں دل چسپی لینا شروع کر دی۔ "عجیب زمانہ آیا ہے، ایسا تو کبھی دیکھا اور نہ خدا دکھائے۔ ایک یہ وقت ہے، ایک وہ زمانہ تھا، خدا بخشے والد مرحوم زندہ تھے۔ گھر پر بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ گابھن ہوئی تو گاؤں بھجوا دی۔ دوسری بلوالی۔ دونوں وقت میں ۳۵ سیر تک دودھ دیا ہے ہماری بھینسوں نے۔ ابا جان زبردستی سر پر سوار ہو کر دودھ پلواتے تھے، جہاں ان کی نظر بچی اور میں نے جھٹ سے کٹورا اوندھا کر دیا۔ اماں تم کو تعجب ہوگا۔ ہمارے آنگن کا فرش کچا تھا۔ جہاں میں دودھ ڈالتا تھا وہاں کی زمین ایسی چکنی ہو گئی تھی کہ نچوڑو تو چکنائی ٹپک پڑے۔" پہلوان کہنے لگا، "کیوں نہیں ماسٹر صاحب، کیوں نہیں۔ اُس دودھ کی کیا بات تھی۔"

فرزند علی جیسے اس کو مرعوب ہی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کہنے لگا، "سستا زمانہ تھا۔ دو روپے میں نوکر مل جاتا تھا۔ گھر میں،

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو، کوئی درجن بھر ملازم ہوں گے۔ پوری پلٹن تھی۔ اس خیال سے کہ ابا جان ہم کو دودھ نہ پلا دیں، چپکے چپکے ان کو گلاس بھر بھر کر پلا دیتے تھے...... پھول پھول کر مکھنا ہاتھی ہو گئے تھے۔''

پہلوان نے بات کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ دودھ نکالنے کی ڈونگی اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی تھی۔ وہ اس کو اٹھانے کے لیے دوسری طرف جھک گیا۔ فرزند علی کی طرف سے اُس کی پیٹھ تھی۔ اچانک اُس کی نظر لکڑی کے اس ڈبے پر پڑ گئی جو کھلا ہوا تھا۔ اُس میں کچھ ریزگاری، چند روپے اور ایک دس والا نوٹ پڑا تھا۔ فرزند علی نے لمحہ بھر تک اُس طرف دیکھا اور پھر بلی کی طرح چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر اُس نے نوٹ اٹھالیا۔ اُسی وقت دودھ والا پہلوان دودھ کی ڈونگی اٹھا کر اپنی جگہ آ گیا۔ فرزند علی نے گھبرا کر نوٹ شیروانی کی نچلی جیب میں ڈال لیا۔

دودھ والے نے اُس کے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو کہنے لگا، ''کیوں ماسٹر صاحب کیا ہو گیا؟''

فرزند علی کہنے لگا، ''کچھ نہیں بھئی، بیٹھے بیٹھے پیٹ میں مروڑ سی معلوم ہوئی۔ خدا خیر کرے۔'' ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر چلنے لگا۔ پہلوان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ گلّے سے روپے نکال کر گننے لگا۔ پھر خود ہی بولا، ''یہ دس کا نوٹ کیا ہو گیا۔'' فرزند علی اور گھبرا گیا۔ اس نے سوچا اب یہاں سے کھسک جانا ہی بہتر ہوگا۔ اس نے اپنے خالی پیٹ کو خواہ مخواہ زور سے دبوچ لیا، ''بھئی بڑی تکلیف ہو رہی ہے میں تو چلا۔'' دودھ والے نے جیسے سنا ہی نہیں۔ نوٹ کے غائب ہو جانے سے وہ بے حد پریشان ہو رہا تھا۔

اتنے میں پلنگ پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پوچھنے لگا:

''چاچا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

وہ کہنے لگا، ''ایک دس کا نوٹ جانے کہاں چلا گیا۔'' اس کا بھتیجا بھی اٹھ کر وہاں آ گیا۔ فرزند علی اب دکان سے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

ابھی چند قدم ہی وہ چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ کر کہا، ''ذرا اِدھر آنا جی۔'' فرزند علی نے گھوم کر دیکھا، پہلوان کا بھتیجا اس کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا:

''چاچا نوٹ یہ رہا۔''

اس نے فرزند علی کی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔ وہ ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں اُس نے نوٹ اس طرح رکھا تھا کہ جیب میں اسے اس کا ایک سرا دکھائی دے رہا تھا۔ دکان دار کو فرزند علی پر ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو کر دکان سے نیچے کود پڑا اور جاتے ہی اس نے فرزند علی کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل گر پڑا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا

ہو گیا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ منہ سے بول نہیں پھوٹ رہا تھا۔ لیکن پہلوان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے لپک کر اُس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا۔ فرزند علی کہنے لگا:

''اماں گریبان تو چھوڑو۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔''

پہلوان نے اُس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا اور چیخ کر بولا، ''شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے۔'' فرزند علی نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے کہا، ''اچھا میرا گریبان تو چھوڑو۔ شیروانی کا کالر خراب ہو جائے گا۔'' دودھ والے نے اِس زور کا جھٹکا دیا کہ شیروانی کندھے پر سے پھٹ کر کمر تک آ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر اُس کو مارنا شروع کر دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا:

''......چور! مار مار کر تیرا بھرکس نکال دوں گا۔ تو اسی لیے اتنی رات کو دکان پر آیا تھا۔'' فرزند علی آہستہ آہستہ بول رہا تھا، ''تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ تمہارا نوٹ مل گیا۔ اب مجھ کو چھوڑ دو۔ تم نے اتنا مار بھی لیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو۔'' مگر پہلوان ذرا بھی متاثر نہ ہوا کہنے لگا:

''میں تجھ کو تھانے لے جاؤں گا......تجھ کو یوں نہیں چھوڑوں گا۔''

شور سن کر پاس پڑوس کے بہت سے لوگ نکل کر وہاں اکٹھا ہو گئے۔ پہلوان نے اب اُس کی قمیص کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ فرزند علی بار بار کہہ رہا تھا کہ، ''میری بات تو سنو۔'' اتنے میں ایک شخص آ گیا۔ جو کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اُس کو فرزند علی کی حالت پر ترس آ گیا۔ اس نے پہلوان سے ڈانٹ کر کہا:

گریبان تو چھوڑو۔''

پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ وہ آدمی فرزند علی سے کہنے لگا، ''پہلے آپ بتائیے کہ بات کیا تھی؟''

فرزند علی کہنے لگا، ''صاحب میں شریف آدمی ہوں۔ یہ بدمعاش لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھیے، میری اتنی اعلیٰ شیروانی بھی پھاڑ ڈالی اور برابر مار پیٹ رہے ہیں۔'' وہ مسکین بنا ہوا جھوٹ موٹ کی صفائی پیش کرنے لگا۔'' خدا کی قسم، میں نے اس کا نوٹ دیکھا تک نہیں۔'' پہلوان کا بھتیجا ایک دم چیخ کر بولا:

''او سور کے بچے! جھوٹے۔ ابھی تو تیری جیب سے نوٹ نکلا ہے۔''

اُس کے جھوٹ بولنے پر پہلوان کو پھر غصہ آ گیا۔ وہ اُس کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگا۔ اس نے پھر جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور فرزند علی کے حمایتی کی طرف آنکھیں نکال کر بولا، ''دیکھیے بابو جی! آپ اس معاملے میں نہ بولیے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔''

بے چارے بابو جی پہلوان کی خوں خوار آنکھوں سے سہم کر رہ گئے، وہ بات کو آگے نہ بڑھا سکے۔ اور مجمع سے کھسک کر

پیچھے آ گئے۔ پہلوان کو اِس بات کی ضد تھی کہ وہ فرزند علی کو تھانے لے جائے بغیر باز نہیں آئے گا۔ اتنے میں کسی نے ہجوم میں سے چیخ کر کہا:

''پہلوان تھانے لے جا کر کیا کرو گے۔ دس بیس جوتے مار کر چھوڑ دو...... بال بچے والا ہے، یہ تو جیل چلا جائے گا۔ وہ بے چارے بھوکے مریں گے۔''

پہلوان اِس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ اتنے میں اسی آدمی نے، جس نے یہ مشورہ دیا تھا، جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ جوتے مارنا شروع کر دیے۔

فرزند علی چیختا رہا، ''میری بات تو سنو، میں شریف آدمی ہوں۔'' مگر وہاں کون اس کی سنتا تھا۔ وہ قسمیں کھاتا رہا۔ اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا۔ مگر جوتے دھڑا دھڑ پڑتے رہے۔ پھر اُس آدمی نے ہانپنے کے سے انداز میں ہاتھ روک کر کہا، ''اچھا اب اس کو جانے دو۔'' اور وہ فرزند علی کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں کی بھیڑ میں سے باہر نکال لایا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا:

''کہو استاد کیسا صاف بچوا دیا۔ ورنہ ابھی حوالات میں ہوتے۔ تم شریف آدمی ہو۔ اِسی کو غنیمت جانو۔''

فرزند علی کو اِس پر بے حد غصہ آیا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ چپ چاپ شریف آدمی کی طرح اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر میں جا کر اُس نے دیکھا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور بیوی جاگ رہی تھی۔ اُس کی پھٹی ہوئی شیروانی اور بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر بولی:

''ہے ہے! کیا ہو گیا۔ کسی سے لڑ کر آئے ہو؟ شور تو میں نے بھی سنا تھا۔''

وہ خشمگیں نظروں سے گھور کر بولا، ''کچھ نہیں ہوا۔''

وہ اصرار کرنے لگی، ''کچھ تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟''

وہ بگڑ کر بولا، ''یہ روشنی کمرے میں کیسے ہو رہی ہے؟ تم پھر اُس خبیث مستری کے یہاں گئی تھیں۔ میں نے ہزار دفعہ سمجھا دیا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ مگر تم ذات کی ڈومنی ہو ڈومنی۔ کمین خصلت کہیں جا سکتی ہے۔'' وہ اس پر برس پڑا۔

وہ خوشامد کے سے انداز میں بولی، ''اُس کے یہاں کب گئی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد، بچے سب جاگ اٹھے تھے۔ ان کو بہلانے کے لیے کلب کی طرف لے گئی تھی۔ وہاں آج کوئی بڑا جشن تھا۔ بڑی بھاری دعوت تھی، خوب روشنی ہو رہی تھی، بینڈ بج رہا تھا، عورتیں اور مرد مل کر ناچ رہے تھے۔'' وہ بچوں کی طرح ایک ایک بات تفصیل سے مزا لے کر بتا رہی تھی۔

''وہیں کوڑے کے بڑے ٹین میں سے یہ بچے نہ جانے کیسے ایک موم بتی ڈھونڈ لائے۔ اُسی کو میں نے جلا دیا۔''

فرزند علی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا اور فرش پر پڑے ہوئے ایک ٹوسٹ کے ٹکڑے کو دیکھ کر بولا، ''اور وہیں

کوڑے گھر سے، لوگوں کے بچے کچے کھانے کو بھی اٹھالائیں۔ میں کہتا ہوں، تم کیوں میری عزت کے پیچھے پڑی ہو۔ دنیا میں ایسی بھی عورتیں ہیں۔ جن پر سات سات وقت کا فاقہ پڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور ایک تم ہو۔''

بیوی کی...... چوری پکڑ لی گئی تھی۔ وہ جھنجھلا کر بولی، ''تو آخر میں کیا کروں ان...... نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دی تھیں۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ فرزند علی کو اُس کا اِس طرح رونا بہت برا لگا۔ اُس نے غصے میں اُس کے بال پکڑ کر اِس زور سے کھینچے کہ وہ فرش پر منھ کے بل گر پڑی۔ فرزند علی اس وقت واقعی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس کی کمر پر اور پیٹھ پر جوتوں کی ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ شور سن کر بچے بھی جاگ اٹھے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ فرزند علی نے چیخ کر کہا، ''چپ ہو جاؤ، سور کے بچو۔'' مگر دو سور کے بچے تو ڈانٹ سے خاموش ہو گئے۔ البتہ سور کی بچی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ فرزند علی نے جھنجھلا کر اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑھکتی ہوئی بستر کے دوسرے کنارے تک چلی گئی اور خوف زدہ ہو کر اس کو دیکھنے لگی، فرزند علی لمحہ بھر تک گھورتا رہا۔ پھر جیسے اس کو خود ہی اپنی حالت پر ترس آ گیا۔ وہ وحشیوں کی طرح پلٹا اور دیوار پر سر دے مارا۔ ''اور لو اور لو، اور لو۔'' وہ دیوانوں کی طرح دیوار پر ٹکریں مارتا رہا۔ پیشانی پر سے اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ دھندلی روشنی میں خون سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ بے حد خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ بچے چیخ کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ لیکن فرزند علی اس طرح زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے پیر کانپنے لگے تھے اور پھر وہ نڈھال ہو کر فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں گھور اندھیرا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کو محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہے۔ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہو چکا تھا اور پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

(راتوں کا شہر)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شریف آدمی نے کسل مندی کیسے دُور کی؟

ب) بچے صبح ہی صبح کہاں چلے گئے تھے؟

ج) مستری کچھ کھائے پیے بغیر ڈیوٹی پر کیوں جا رہا تھا؟

د) فرزند علی اپنے خالہ زاد بھائی کو چائے کیوں نہ پلا سکا؟
ہ) ماسٹر کی بیوی نے خاوند کو کھانے کے لیے پلیٹ میں کیا دیا؟
و) ہیڈ ماسٹر کیوں جل بھن کر رہ گیا تھا؟
ز) امریکہ میں کپڑے ہر سیزن میں کیوں آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں؟
ح) ہجوم میں موجود شخص نے فرزند علی کو حوالات جانے سے کیسے بچایا؟

۲۔ سبق کے مطابق خالی جگہ پُر کریں۔

الف) فرزند علی کے............ بچے تھے۔ (تین ۔ پانچ ۔ سات)
ب) فرزند علی پیشے کے اعتبار سے............ تھا۔ (ٹیچر ۔ ہیڈ ماسٹر ۔ پروفیسر)
ج) پہلوان نے فرزند علی کا............ پکڑا۔ (گریباں ۔ بازو ۔ دامن)
د) فرزند علی نے دس روپے کا نوٹ............ کی جیب میں چھپالیا۔ (شیروانی ۔ قمیص ۔ واسکٹ)
ہ) بچہ............ ہوا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ (گھبرایا ہوا ۔ ڈرا ہوا ۔ سہما ہوا)
و) بیٹھو میاں!............ پیتے جاؤ۔ (شربت ۔ چائے ۔ پانی)
ز) آنگن میں............ بھائی کی آواز سنائی دی۔ (پھوپھی زاد ۔ چچازاد ۔ خالہ زاد)
ح) بھئی! تو کسی اچھے............ کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کرو۔ (طبیب ۔ حکیم ۔ ڈاکٹر)

۳۔ سبق کے مطابق درست کے نشان (✓) اور غلط کے (✗) سے کریں۔

الف) فرزند علی پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔
ب) ڈرائیور کوئٹہ کا گورا چٹا نوجوان تھا۔
ج) انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک آدمی کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔
د) ماسٹر جی بہت اچھی انگریزی بول لیتے تھے۔
ہ) آپ کی گھر والی دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آجاتی ہے۔
و) بیوی بولی! بچی کی چونی لے کر تو آلو منگائے تھے۔
ز) فرزند علی نے شیروانی اتار کر صندوق میں بند کر دی۔
ح) فرزند علی نے دکاندار سے کہا ”تم آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔

۴۔ ذیل تراکیب / محاورات کو جملوں میں استعمال کریں۔

دن کٹنا ۔ لقمہ دینا ۔ تاؤ آنا ۔ کھیسیں نکالنا ۔ ہرج نہ ہونا۔

کروٹیں بدلنا ۔ سناٹا چھا جانا ۔

ڈھاک کے تین پات ۔ سسکیاں بھرنا ۔ منہ بسورنا ۔ پیچ و تاب کھانا ۔ آواز بھر آنا

۵۔ فرزند علی کی شخصیت پر مختصر روشنی ڈالیں۔

۶۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا.......... پھر کوئی بات چیت کی جائے۔

۷۔ افسانہ ”شریف آدمی“ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۸۔ افسانہ ”شریف آدمی“ کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۹۔ افسانہ ”شریف آدمی“ میں مصنف نے جن سماجی مسائل کی نشاندہی کی ہے انھیں مختصر بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے معاشرتی و عملی زندگی کے مسائل کے حوالے سے ان کے جذبات و خیالات اور مافی الضمیر کے اظہار کے حوالے سے مضمون تحریر کروائیں اور ان سے اس کا زبانی اظہار بھی کروائیں۔

۲۔ طلبہ سے کوئی اخباری مواد یعنی نیوز سٹوری یا آرٹیکل وغیرہ تحریر کروائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو افسانے کے تدریجی ارتقا سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو افسانے میں مختلف رجحانات کے بارے میں بتائیں۔

۳۔ شوکت صدیقی کے اسلوبِ تحریر پر لیکچر دیں۔

۴۔ اُردو افسانوی ادب میں شوکت صدیقی کا مقام بتائیں۔

الطاف فاطمہ

(حالاتِ زندگی)

الطاف فاطمہ ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ میں فضل آمین خان کے ہاں پیدا ہوئیں۔ جو مسلم ریاست جاورہ کے چیف سیکرٹری تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آئیں۔ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج لاہور سے بی۔ایڈ کیا۔ اورینٹل کالج لاہور سے اُردو میں ایم۔اے کیا اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین لاہور میں اُردو کی استاد مقرر ہوئیں اور یہیں سے اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر اُن کے متعدد ڈرامے اور فیچر نشر ہو چکے ہیں۔

الطاف فاطمہ نے ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت بہت شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی دردمندی ہے۔ معاشرتی زندگی میں لوگوں پر جو طرح طرح کے ظلم ہو رہے ہیں۔ الطاف فاطمہ نے بڑی شدّت سے ان کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اس مقصد کے لیے تیکھے طنز سے کام لیا ہے۔ اس لیے اُن کی تحریروں میں درد، کرب اور غم موجود ہے۔ وہ طنز کے ذریعے معاشرے کی خامیوں کی اصلاح کی آرزومند ہیں۔ اس لیے وہ زندگی میں جہاں بھی جھول اور ظلم دیکھتی ہیں۔ وہاں طنز کرنے سے نہیں چوکتی۔ اُن کے طنز میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔

الطاف فاطمہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اُن کی زبان ہمیشہ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ جس میں شگفتگی، برجستگی اور بے ساختگی بدرجہ اُتم موجود ہوتی ہے۔ جملوں میں سادگی کے ساتھ ادبی حُسن بھی موجود ہوتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں تشبیہات بھی موجود ہوتی ہیں۔ جو بیان کو خوبصورت اور دلچسپ بناتی ہیں۔

اُن کے افسانے ندرتِ موضوع کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوئے۔ اُن کے بیش تر افسانوں کا موضوع اچھوتا ہے۔ اُن کے ناولوں اور افسانوں کے کردار ہماری زندگی کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ اِن کرداروں سے ہم زندگی کے ہر موڑ پر ملتے ہیں بلکہ اِن کرداروں میں ہمارے ہی جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔

اُن کی مشہور تصانیف میں نشانِ محفل (ناول) دستک دو۔ چلتا مسافر، وہ جسے چاہا گیا (افسانوں کا مجموعہ)، رات کا کھیل، نغمے کا قتل، دیواریں گریہ کرتی ہیں، دستک نہ دو (اس پر انہیں ادبی انعام بھی دیا گیا) شامل ہیں۔

نیا گوتم

(الطاف فاطمہ)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو افسانے میں تدریجی ارتقا سے آگاہ کرنا۔
۲۔ اُردو افسانے کے فکری رجحانات سے واقفیت دلانا۔
۳۔ الطاف فاطمہ کے افسانوی کرداروں سے متعلق آگاہی دینا۔
۴۔ الطاف فاطمہ کا اسلوبِ تحریر اور فنی خصوصیات بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: بے گیاہ ۔ قطع زمین ۔ حدِ فاصل ۔ برگد کا درخت ۔ زمانِ حیات ۔ بطن ۔ وحدت الوجود
عشرتِ قطرہ ۔ آئیوی ۔ کوکھ ۔ وائرس

کے ڈی ہاؤس نمبر گیارہ کی کہنہ اور زرد رُو عمارت کا اونچا کالا آہنی گیٹ دوپہر کی آمد سے قبل دس اور گیارہ کی درمیانی اور معمول کے مطابق طاری رہنے والی خاموشی میں ڈوبا اور چپ چاپ ہے۔ آج سے تیس پینتیس سال یا اس سے بھی کچھ قبل کے طرز کے مطابق بنی چار دیواری کے اطراف چھپا بے گیاہ کمپاؤنڈ بے رونقی اور بے مذاقی کا شکار ہے۔

اس کمپاؤنڈ کے اُس طرف والے حصے میں مزنگ بلاک کی متوقع تعمیر کا اعلان کرنے والا بورڈ ہر آنے جانے والے کو ہمیشہ کی طرح اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ ہوسٹل کی عمارت اور مزنگ بلاک والے قطع زمین کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے والے درختوں میں چند شیشم کے درخت ہیں اور ان کے درمیان ایک برگد کا درخت کھڑا ہے۔

برگد کا درخت اور ایک طویل زمانِ حیات کا تصور ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ نہ جانے کتنے زمانے اور صدیاں یہ اپنی لپیٹ میں لیتا چلا جاتا ہے۔ تاریخ کا تسلسل اور کھوئے ہوئے سارے زمانے اس کے بطن میں محفوظ رہتے ہیں۔ برگد کے درخت کا بطن یعنی شاخوں اور ڈالیوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے والی قوتِ نمو اپنے اظہار اور نمود کے بے پناہ جذبے اور خواہش سے مغلوب ہو کر برگد کی داڑھیوں کی شکل میں باہر نکل پڑتی ہے اور پھر اس تیزی سے بڑھتی ہیں کہ ایک بار ہی جھک کر زمین کو مضبوطی سے تھام لیتی ہے اور پھر زمین کی کوکھ دھیرے دھیرے کھلتی ہے اور اس کے آخری سِروں کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے اور باریک باریک رگوں جیسی شاخوں والی داڑھی جو تِس نَس ہو کر بکھری تھی پھر ایک تنے سے متصل ہو کر اپنا وجود مسلّم کر لیتی ہے۔

برگد کا درخت عالمِ نباتات میں وجود کی شکست و ریخت اور ضرب در ضرب وجود کے تسلسل اور زندگانی کی جُہد کی دلچسپ ترین داستان ہے ہم نے حیات اور وجود کی اس ٹوٹ پھوٹ اور عملِ ضربی کو فلسفۂ وحدت الوجود کا نام دیا۔ برگد کا درخت عشرتِ قطرہ کی عملی تفسیر اور تشریح ہے۔ ایک واضح اور مکمل فارمولا۔ اور گوتم کو جب زندگی کی توڑ پھوڑ، ضرب در ضرب کے عمل اور

اس کی درمیانی کڑیوں نے مایوس کیا۔

؎ تو وہ برگد کے پیڑ کے نیچے جا بیٹھا
سرنگوں اور شکست خوردہ ہو کر

اور اپنی اس شکست اور احساسِ شکست کو اس نے گیان و دھیان کا نام دیا۔

لیکن عجو! زندگی کی اس توڑ پھوڑ اور اپنے اندر دوڑتی ہوئی اس وائرس (Virus) کے عمل ضربی سے ہراساں ہو کر تم نے تو برگد کے درخت کا رُخ نہیں کیا۔ تم نے تو اپنی مایوسی اور شکست خوردگی کو گیان اور دھیان جیسے مرعوب کُن پردوں میں لپیٹ کر پُراسرار نہیں بنایا اور جب کہ برگد کے پیڑ تک پہنچنے کے لیے پاٹلی پتر کے محلوں کو چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہ تھی، برگد کا پیڑ تو خود تیرے ہوسٹل کی عمارت کے بالکل قریب کھڑا تھا:

یوں جیسے وہ رگِ جان ہو!

مزنگ بلاک اور ہوسٹل کی عمارت کے درمیان۔

اور تُو اس سے بے نیاز۔ اپنے اندر اور باہر کو چاٹتی ہوئی، اِس وائرس اور اِس کے عملِ ضربی کے نتیجے میں بیدار ہونے والے سارے دُکھوں کو اپنے مختصر سے وجود میں یوں لیے پھرتی تھی جیسے وہ بھی قدرت کا ایک عطیہ ہو، جس کو تُو سنبھال کر رکھ رہی تھی۔

؎ بے شک تحفہ تحفہ ہی ہوتا ہے
خواہ وہ کتنا ہی گراں بار کیوں نہ ہو

پھر یوں ہوتا ہے کہ ہم میں سے بہت سے ایسے گراں بار تحفوں کی سہار سے عاجز نظر آتے ہیں۔ وہ اس کے بوجھ تلے کچلے جاتے ہیں، بلکتے ہیں، فیل کرتے ہیں اور واویلا مچاتے ہیں، اور ہم میں سے کتنے ہوتے ہیں جو غم اور دکھ کے بارِ عظیم کو ایک انمول تحفے کی طرح سینے سے لگا کر رکھتے ہیں اور جب ہم اپنے غموں سے چپکے چپکے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور جب ہم اپنے دکھوں سے رازداری اور وفاداری کا پیمان باندھ لیتے ہیں تو پھر زندگی کی سب سے دل کش داستان شروع ہوتی ہے کہ ہم غم کے اسرار کے امین ہوتے ہیں اور دنیا ہمارے حال پر ہنستی ہے۔ میرا مطلب ہے روتی ہے اور ہم دنیا پر ہنستے ہیں کہ وہ نہیں جانتی کہ ایک استوار وعدۂ رازداری کا ایک مستقل پیمان، زندگی کا حسین ترین رُخ ہوتا ہے۔

تو عجو، بات یہ ہے کہ تم اپنے دکھ کی امین تھیں۔ ایک باوفا اور پوری امانت دار، جبھی تو تم کے ڈی ہاؤس کی زرد عمارت اور اس کے بے گیاہ کمپاؤنڈ سے ایک بے فکر چڑیا کی طرح ہنستی مسکراتی نکل کر کوئنز روڈ کی مصروف، اہم اور چمکتی ہوئی سیاہ سڑک

کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی گنگارام کی عمارت میں داخل ہوتی تھیں۔ چھوٹا سا سفید اوورآل پہنے، گلے میں اسٹیتھوسکوپ ڈالے۔

اور یہ چیزیں علامت ہیں مسیحائی کی۔

تم جنرل وارڈ کے مریضوں کے سرہانے کھڑی ہوتی تھیں۔ اپنی بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ اور نرم نرم آواز کے ساتھ اُن کی کیس ہسٹری لیتی تھیں۔ تم نے ان کو بار ہا مداوائے درد کی نوید سنائی تھی اور کبھی دکھ سے یہ بھی سوچا تھا کہ:

اپنا ہی مداوا نہ کر سکے

تم نے ان کے دکھ سنے۔ ان کی موجودہ اور گزشتہ سے پیوستہ تکلیفوں کا کھوج لگایا۔ تمہارے معصوم سے تبسم نے ان سے بہت سے ان کہے وعدے بھی کیے، لیکن ان میں سے کتنے ہوں گے جنھوں نے تمہارے اندر کی چوری کو پکڑا ہوگا۔

ہاں عذرا، تمہاری آنکھوں میں چور تھا اور تمہاری یہ چوری میں نے کب کی پکڑ لی تھی۔ یہ بھی میرے اور تمہارے درمیان ایک راز تھا کہ جب بھی تم مجھے کہیں ملیں کوئنز روڈ کے کسی موڑ پر یا گنگا رام کی راہ داری میں یا کسی وارڈ کے آگے چلتی پھرتی یا کھڑی بیٹھی۔ خالد کے آفس میں یا عطیہ کے ساتھ، میں نے تم سے کبھی پوچھ کے ہی نہ دیا۔

یا یوں کہو کہ باہر ایک دنیا والوں کو اطمینان دلا دیا کہ میں خوش ہوں۔ میرا دل گمانوں سے پاک ہے اور مجھے کوئی غم نہیں۔ میں نے دکھ کی مملکت کو تسخیر کرلیا۔ لیکن عجو! مملکتوں کا تسخیر کرنا ہی تو ازلی اور ابدی دکھ ہے۔ کون جانے اس تسخیر کرنے والے کا دل اندر سے کتنا بھاری ہو۔ سکندرِاعظم نے ہر مملکت کو تسخیر کرنے کے بعد رات کی تنہائیوں میں کتنی بار آنسو بہائے ہوں گے۔ نپولین کی محبوبہ نے کتنی بار اپنے بازوؤں پر اُس کے اشکوں کی نمی کو محسوس کیا ہوگا اور عذرا تمہارے نرم نرم تکیے کی دَبازت میں کتنی بار تمہاری پلکوں کے ستارے بکھر بکھر کر محفوظ ہوئے ہوں گے! ان باتوں کا حساب کون دے سکتا ہے؟ یہی تو انسان اور زندگی کے درمیان راز ہوتے ہیں۔ اِن رازوں پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے، لیکن بعض راز ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا انکشاف کر کے ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ تو ایسا ہی ایک چھوٹا سا انکشاف میں بھی کرتی جاؤں۔

عجو! آج میں تمہارے ہوسٹل گئی تھی، حالاں کہ جب تمہارے کراچی جانے سے قبل میں تم سے ملنے گئی تھی تو وہاں سے اُترتے وقت میں نے سوچا تھا کہ میں اِس ہوسٹل میں پہلی اور آخری بار آئی ہوں۔ یہ لڑکی جسے الوداع کہنے میں آج یہاں اس زینے پر سے گزر کر آئی تھی، اب کبھی واپس نہ آنے کے لیے جارہی ہے اور اب بھلا میں یہاں کاہے کو آؤں گی، لیکن آج میں اُس طرف گئی ہر طرف خاموشی تھی، سکوت تھا اور سناٹا۔ اس لیے نہیں کہ تم یہاں نہ تھیں بلکہ اس لیے کہ یہاں اِس وقت سناٹا ہوا ہی کرتا ہے۔ یوں کہ اِس وقت یہاں رہنے والی لڑکیاں چارہ گری کے آخری مدارج طے کرنے کے لیے گنگارام کی طرف روانہ ہوچکی

ہوتی ہیں اور تم بھی تو چارہ گری کے اس مرحلے میں تھیں تو خیر کوئی بات نہیں۔

میں وہاں گئی تھی، مگر کس کے پاس یہ مجھے خود نہیں معلوم۔ پھر میں چلتی چلتی وہاں جا کر کھڑی ہوئی جہاں تین چار آدمی ایک بلند و بالا اور ہرے بھرے شیشم کو جڑ کے قریب سے کاٹنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ درخت آج نہیں، کل ضرور گر جائے گا، میں نے سوچا اور ابھی یہ ہرا بھرا ہے۔

نلکے کے قریب ہوسٹل کا چپڑاسی بیٹھا تھا۔ کس سے ملنا ہے؟ اُس نے مجھے بے مقصد کھڑے دیکھ کر سوال کیا۔ کس سے بتاؤں، میں نے سوچا۔ ڈاکٹر عطیہ سے! حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں اس وقت موجود نہیں۔ تب وہ بولا۔ آیئے میں آپ کو لے چلوں آٹھ نمبر کمرہ ہے، ہم صدر دروازے سے راہداری میں داخل ہوئے جس کی چوبی دیواریں منقش ہیں۔ بھاری اور مضبوط کٹہرے والے زینے پر سے گزر کر وہ برآمدے کو جانے والے دروازے کو بڑی دیر تک کھٹکھٹاتا اور مائی کو آواز دیتا رہا۔

مجھے معلوم تھا وہاں کوئی نہیں بولے گا، مگر میں بڑی مستعدی سے یوں کھڑی رہی جیسے کوئی ابھی آئے گا اور دروازہ کھول دے گا۔ چوبی کٹہرا گرد آلود تھا۔ اس پر مہینوں پہلے کی خاک جمع تھی۔ اچھا تو اس میں اس لڑکی کے قدموں کی دھول بھی ہوگی۔ جو گوتم تھی اور اپنے وقت کی بدھ بھی کہ اس کو دُکھ کا عرفان تھا اور اس نے اس کے متعلق گیان بھی کیا تھا۔

یہ نئے دور کے بدھ اور گوتم کا گیان تھا کہ اگلے وقتوں کے گوتم نے اپنے گیان کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ آبادیوں اور بستیوں سے دور جا کر برگد کے پیڑ تلے بیٹھے اور انسان سے دور رہ کر انسان کے المیے پر غور کرے اور آج کے گوتم کو بدھی یعنی اپنے اندر کی روشنی کے لیے کسی برگد کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا برگد خود اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ تناور اور صدیوں کا پرانا برگد۔ ضرورت فقط تلاش اور باطن کی آنکھ کی ہے جو آج بھی کم یاب ہے اور اس وقت بھی نایاب تھی۔

سو عذرا تم نے اپنا برگد خود اپنے آپ میں پا لیا تھا۔ اور اپنے آپ کی چھایا تلے بیٹھ کر تم نے یہ بدھی پائی کہ موت و حیات ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ حیات جہاں پر جاتی ہے وہاں موت کے قدموں کی چاپ موجود ہے اور زندگی کے دوسرے سرے کا نام موت ہے۔ جبھی تو تم اپنی جاتی ہوئی حیات کے قدموں سے بے نیاز لیبر روم میں کھڑی نئی زندگیوں کو باہر آنے میں مدد دیتی تھیں اور پھر خوشی خوشی ہر دکھ سے مبرا آواز میں بتاتی تھیں۔ ''آج میں نے اتنی نئی زندگیوں کو دنیا میں آنے میں مدد دی ہے۔''

تب میں نے اُس آدمی سے جو شیشم کے تنے پر مستقل تبر مار رہا تھا، سوال کیا، ''تم اس درخت کو کیوں کاٹ رہے ہو؟''

''مزنگ بلاک کے لیے زمین صاف کر رہے ہیں۔''

''اوہ! اچھا تو پھر سارے درخت کاٹ دو گے؟''

''ہاں! یہ! یہ بھی، میں نے برگد کے درخت کی طرف اشارہ کیا۔''

''ہاں یہ بھی۔''

''ہاں ضرور کاٹ دو!''......اُس نے میری طرف غور سے دیکھا گویا پوچھتا ہو کیوں!

میں اُس بلند و بالا آہنی گیٹ سے باہر آ گئی۔ میں نے مطمئن نظروں سے اُس انسان کی طرف دیکھا جو بے وجہ میرے لیے دروازہ کھٹکھٹا تا رہا تھا اور جس کو خبر نہیں کہ میں اس حقیقت سے پہلے ہی باخبر تھی کہ دروازہ نہیں کھلے گا۔

اور عذرا تم بھی اس راز سے آگاہ تھیں کہ چارہ گر لاکھ سر مارے، دعائیں ہزار دستک دیں، اب دروازہ نہیں کھلے گا۔

اور اس راز کی آگاہی نے تم پر عرفان کے در وا کر دیے تھے بغیر کسی پاٹلی پتر کو چھوڑے اور بغیر کسی برگد کے تلے بیٹھے۔

چناں چہ، مجھے اس شخص کے سوال کا جواب سوجھ رہا تھا جو مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھتا ہو کہ اس درخت کے کاٹنے پر تم نے کیوں اصرار کیا؟

ہاں! اب میں اس سے کہہ سکتی تھی۔

بے شک تم اس درخت کو کاٹ دو کہ آج کے گوتم کو برگد کے درخت کی ضرورت نہیں۔ نیا گوتم مزے سے اوور آل پہنے اسٹیتھوسکوپ گلے میں ڈالے بیماروں کو مژدۂ حیات دیتا ہے اور آپ اپنی چھاؤں تلے اپنے دکھوں کا گیان حاصل کرتا ہے۔

(ماخذ)

مشق

ا۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) گوتم نے اپنے احساس کو کیا نام دیا؟

ب) مستقل بیانِ زندگی کا حسین ترین رُخ کیا ہوتا ہے؟

ج) مسیحائی کی علامت کونسی چیزیں ہیں؟

د) ہوسٹل کا چپڑاسی کہاں بیٹھا تھا؟

ہ) عذرا کی آنکھوں میں کیا تھا؟

و) سکندرِ اعظم نے ہر مملکت کو تسخیر کرنے کے بعد کب آنسو بہائے ہوں گے؟

ز) آج کے گوتم کو اپنے اندر کی روشنی کے لیے کس چیز کی ضرورت نہیں؟

ح) موت کے قدموں کی چاپ کہاں ہوتی ہے؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب دیں۔

الف) ہم اپنے غموں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ (چپکے چپکے ۔ آہستہ آہستہ ۔ فی الفور)

ب) یہ چیزیں علامت ہیں۔ (دانائی کی ۔ مسیحائی کی ۔ عقل مندی کی)

ج) عذرا آواز کے ساتھ کیس کی ہسٹری لیتی ہیں۔ (نرم نرم ۔ تلخ ۔ میٹھی میٹھی)

د) ان کی موجودہ اور گزشتہ سے پیوستہ کا کھوج لگایا۔ (بیماریوں ۔ دکھوں ۔ تکلیفوں)

ہ) ہاں عذرا تمہاری آنکھوں میں تھا۔ (چور ۔ ہمدردی ۔ خوشی)

و) بہت سے تخفوں کی سہار سے نظر آتے ہیں۔ (مجبور ۔ عاجز ۔ بے بس)

ز) عذرا نے دنیا کو اطمینان دلایا کہ میں ہوں۔ (دکھی ۔ خوش ۔ غمگین)

۳۔ متن کے مطابق درست (✓) اور غلط (✗) کی نشاندہی کریں۔

الف) عذرا ایک استانی تھی؟

ب) برگد کا درخت عالمِ نباتات میں شکست و ریخت کی دلچسپ ترین داستان ہے۔

ج) عذرا نے دنیا والوں کو اطمینان دلایا کہ وہ خوش ہے۔

د) درخت کے قریب ہوسٹل کا چپڑاسی بیٹھا تھا۔

ہ) آدمی مزنگ بلاک کے لیے تمام درخت کاٹ رہے تھے۔

و) زندگی کے دوسرے سرے کا نام موت ہے۔

ز) آج کے گوتم کو برگد کے درخت کی شدید ضرورت ہے۔

۴۔ افسانہ ''نیا گوتم'' میں سب سے نمایاں کونسی چیز ہے؟

۵۔ افسانہ ''نیا گوتم'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۶۔ افسانہ ''نیا گوتم'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۷۔ عذرا کی شخصیت پر مختصر روشنی ڈالیں۔

۸۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

برگد کا درخت اور ایک طویل زمانِ حیات .... شکل میں باہر نکل پڑتی ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے معاشرتی و عملی زندگی کے مسائل کے حوالے سے ان کے جذبات و خیالات اور مافی الضمیر کے اظہار کے حوالے سے مضمون تحریر کروائیں اور ان سے اس کا زبانی اظہار بھی کروائیں۔

۲۔ اخبارات، رسائل و جرائد میں خبروں، فیچروں۔ اداریوں، رپورٹوں، اشتہارات اور خطوط بنام مدیر کو ان کی خصوصیات کے حوالے سے پڑھوائیں اور ان کا تجزیہ کروائیں۔

۳۔ کمرۂ جماعت میں الطاف فاطمہ کے چند اور افسانے بھی سنوائے جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام! طلبہ کو اُردو افسانے کے تدریجی ارتقا سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو افسانے میں مختلف رجحانات کے بارے میں بتائیں۔

۳۔ الطاف فاطمہ کے اسلوبِ تحریر پر لیکچر دیں۔

۴۔ اُردو افسانوی ادب میں الطاف فاطمہ کا مقام بتائیں۔

احمد شاہ پطرس بخاری

(حالاتِ زندگی)

احمد شاہ بخاری یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ قلمی نام ''پطرس'' تھا۔ آپ نے میٹرک تک پشاور میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے علمی اعزاز کے ساتھ آنرز کیا۔ وطن واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ ملازمت چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تعینات ہوئے۔ آپ کی قابلیت کی بنا پر حکومتِ پاکستان نے انھیں اقوامِ متحدہ میں مستقل مندوب بنا کر بھیجا۔ جہاں ترقی کر کے آپ کو اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔

پطرس بخاری نے بہت کم لکھا ہے؛ لیکن جو کچھ لکھا ہے؛ وہ زندہ و جاوید رہے گا۔ اُن کی زبان سادہ، رواں اور سلیس ہے۔ شگفتگی، اِس کا ایک اور جوہر ہے۔ وہ بات کو سیدھے سادھے انداز میں اس طرح لکھتے ہیں کہ قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ وہ اُردو کے علاوہ انگریزی کے بھی اچھے ادیب تھے۔

پطرس بخاری بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں خالص مزاح کی صورتیں ملتی ہیں۔ وہ لفظی ہیر پھیر سے مزاح پیدا کرنے کی بجائے واقعہ نگاری سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ وہ کسی واقعہ کو فطری انداز ہی میں نہیں پیش کرتے بل کہ واقعات کے ردِعمل سے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ اس قدر غیر متوقع ہوتے ہیں؛ کہ قاری بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔

اُن کی مزاح نگاری کسی مقصد کی پابند نہیں اور نہ ہی کسی اصلاحی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ پطرس سے پہلے مزاح میں ہزل، پھکڑ اور پھبتی وغیرہ ملتی تھیں؛ مگر اُنھوں نے اُردو کے مزاحیہ ادب کو اِس سے پاک کیا ہے۔ اپنی مزاح نگاری کو طنز اور تمسخر کی آلودگی سے بچایا ہے۔ وہ مغربی ادب کی مزاح نگاری کے حربوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اور اپنے مضامین میں مزاح پیدا کرنے کے لیے اِن سے خوب کام لیتے ہیں۔

اُن کا طنز کبھی کبھی طنزِ ملیح کے انداز میں ملتا ہے۔ وہ عام زندگی میں بھی ہمدرد انسان تھے اس لیے طنز کر کے کسی کا دل نہیں دکھا سکتے تھے۔ تحریف نگاری میں بھی پطرس کو کمال حاصل ہے۔ آپ کے مضامین کا مجموعہ ''مضامینِ پطرس'' کے نام سے ہے۔ ۱۹۵۸ء میں حرکت قلب بند ہونے سے نیویارک میں وفات پائی۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

(پروفیسر پطرس بخاری)

مقاصد تدریس

۱۔ طلبہ کو طنز و مزاح کی نوعیت اور ماہیت سے آگاہ کرنا۔
۲۔ طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کا گُر بتانا۔
۳۔ اُردو زبان و ادب میں طنز و مزاح کی روایت سے آگاہ کرنا۔
۴۔ اُردو طنزیہ و مزاحیہ ادب میں پطرس بخاری کے مقام کے بارے میں بتانا۔
۵۔ پطرس بخاری کے اسلوبِ نثر کی خوبیوں سے آگاہی دینا۔

خاص الفاظ و تراکیب

پنڈولم ۔ آفت ۔ لٹھ ۔ خدائی فوجدار ۔ عدم تشدد ۔ بنی نوع انسان ۔ ٹھیکا
بڑبڑانا ۔ رومان انگیز ۔ سہم جانا

گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ ''لالہ جی! امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں، آپ سحر خیز ہیں؛ ذرا ہمیں بھی جگا دیا کیجیے''۔

وہ حضرت بھی، معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے، ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی اور کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگا اور دیوار پر لٹکا ہوا کلینڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا، میرے آباؤاجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں...... ''اچھا!......اچھا!...... تھینک یو...... جاگ گیا ہوں...... بہت اچھا! نوازش ہے''۔ آنجناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے۔ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سے آواز میں ''قُم'' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جایا کرتے تھے۔ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیش تر اس کے کہ باہر بستر سے نکلیں، دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے اِس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لیمپ جلایا اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی،

تو طوفان تھا۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا کہ آج پتا چلائیں گے یہ سورج آخر کس طرح نکلتا ہے لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشن دان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔ لالہ جی!...... لالہ جی!

جواب آیا ''ہوں''

میں نے کہا ''آج یہ کیا بات ہے کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟''

کہنے لگے ''تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے!''

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا ''کیا کہا تم نے، تین بجے ہیں؟''

کہنے لگے ''تین...... تو...... نہیں...... کچھ سات ساڑھے سات...... منٹ اوپر تین ہیں''

میں نے کہا ''ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا۔ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے۔ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے۔ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اِس وقت دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے۔ ابے احمق کہیں کے! تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیرزادے ہیں کوئی مذاق ہے، لاحول ولاقوۃ''۔

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدّد و شدّ د کو خیر باد کہہ دوں لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا کوئی ہم نے ٹھیکا لے رکھا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسبِ معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے تک منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی، اُس پر شام کا رومان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

؎ بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی ''مسٹر!''

ہم اِس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا ''یہ

پ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا "اجی میں کس لائق ہوں لیکن خیر فرمایئے؟" بولے "ذرا...... وہ میں...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں"۔

بس صاحب ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں"۔ صاحب! خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا! ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے"۔

آنسو پونچھ کر اور دل مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لیے، نکٹائی کھول دی، آستینیں چڑھا لیں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد بھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کونسی پڑھیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعے کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر ایک کتاب کے صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے ہی کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اُٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ، چھ، سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں! یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی۔ "لالہ جی!"

انہوں نے پتھر کھینچ مارا۔ "بس"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تُتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی! صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے......یعنی جس وقت چھ بجیں......"

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا "جب چھ بج چکیں تو......سنا آپ نے؟"

چپ

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ "سن لیا۔ سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گامان پلس فور ایلفا پلس......"

ہم نے کہا "ب۔ ب۔ ب بہت اچھا۔ یہ بات ہے"

توبہ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی آدمی بہت شریف ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انہوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کردی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک دو منٹ بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے اِسے اِس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کردی۔

اِس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیش تر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا نہیں پتا۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا، شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے بیش تر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں...... ہمارا خیال ہے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے، جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتا لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اِس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ "آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا۔ لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیسا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہوجاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا"۔

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے "تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں۔ واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بے شک"۔

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب

سرکا لیا اور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیہ کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے اُن کو گڈ مارننگ کیا اور نہایت بیدردانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا ''دل بھیا! صبح اُٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے''۔ دل نے کہا ''اور کیا تمھارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں''۔ ہم نے کہا ''سچ کہتے ہو یار! یعنی اگر ہم سُستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اِس وقت اِس لاہور شہر میں ہزاروں کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اُڑاتے ہوں گے اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ ''بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں'' ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے..... خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ پس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بہ روز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر، نہ رسول ﷺ کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بے چارہ یہی کہتا کہتا مر گیا لیکن ہمارے کان پر جُوں تک نہ رینگی..... (لحاف کانوں پر سرک آیا)..... تو گویا آج ہم اور لوگوں سے پہلے جاگے ہیں..... بہت ہی پہلے..... یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے پہلے..... کیا بات ہے! خداوندانِ کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اُٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے..... (لحاف سر پر)..... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے..... (آنکھیں بند)..... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈز ورتھ۔ میں جانوں، شیکسپیر بہتر ہوگا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟'' پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں، اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے..... لیکن شیکسپیر..... نہیں۔ ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا..... شیکسپیر..... ہیملٹ..... لیکن..... ورڈز ورتھ..... لیڈی میکبتھ..... دیوانگی..... سبزہ زار..... سنجر سنجر، یادِ بہاری..... صیدِ ہوس..... کشمیر..... میں آفت کا پرکالہ ہوں۔

یہ معما اب مابعدالطبیعات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نہ معلوم کیا بھید ہے؟

کالج ہال میں لالہ جی ملے۔ کہنے لگے ''مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہیں دیا''۔

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا ''او ہو! لالہ جی! یاد نہیں میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا''۔

بولے ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں ...... اس کے بعد ...... کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں''۔

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا، گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے، غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکا یک ایک محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا ''ہاں ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں اس وقت ...... اے ...... اے نماز پڑھ رہا تھا''۔

لالہ جی مرعوب سے ہو کر چل دیے اور ہم اپنے زہد و تقویٰ کی تسکین میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو۔ دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دلِ مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ''ہمارا فراق نازمحو بالشِ کمِ خواب ہو اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو'' ......

غضب یہ ہے کہ پہلے مسٹر ...... مسٹر کی آواز اور دروازے کی دنادن سامعہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے اور چار گھنٹے کے عرصے میں گڑویوں کے گر پڑنے، دیگچوں کے الٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے، کتابوں کے جھاڑنے، کرسیوں کے گھسیٹنے، کلیاں اور غرغرے کرنے، کھنکارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں، اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سرتال کی کس قدر گنجائش ہے؟

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) جاگنے کے بعد مصنف کو وقت کی دُرست سمجھ کیوں نہیں آئی؟

ب) صراحی پر رکھا ہوا گلاس کس طرح بجنے لگا۔

ج) بقول مصنف مطالعے کی پہلی منزل کیا ہے؟

د) مصنف جلدی کیوں سو گئے؟

ہ) دوسرے دن جگانے کے بعد مصنف پر کیا گزری؟

و) مصنف آخر تک کیوں مطالعہ شروع نہیں کر سکے؟

ز) مصنف لالہ کرپا شنکر جی کا شکریہ کیوں ادا کرتے تھے؟

ح) آپ نے مصنف کی شخصیت کو کیسا پایا؟

۲۔ سبق کے مطابق دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) مصنف صبح سویرے اُٹھنا چاہتے تھے۔

i) صبح کی سیر کے لیے ii) مطالعہ کے لیے

iii) نماز پڑھنے کے لیے iv) دفتر جانے کے لیے

ب) مصنف نے دوسرے دن مطالعہ کیا۔

i) ہیملٹ کا ii) لیڈی میکبتھ کا

iii) قرآن مجید کا iv) انجیل کا

ج) لالہ شنکر جی نے پہلے دن مصنف کو جگایا۔

i) تین بجے ii) پانچ بجے

iii) سات بجے iv) نو بجے

د) مصنف ایک طالب علم تھے۔

i) سُست ii) چُست

iii) لائق iv) نالائق

د) مصنف دوسرے دن جلدی سو گیا تا کہ

i) نیند پوری ہو ii) صبح جلدی اُٹھ سکے

iii) کالج بروقت جا سکے iv) دوست سے مل سکے

۳۔ سبق کے مطابق دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) مصنف سحر خیزی کے عادی تھے۔

ب) پہلے دن مصنف کو جلدی جگانے کی وجہ سے بہت غصہ آیا تھا۔

ج) لالہ کرپاشنکر جی وقت کے بہت پابند تھے۔

د) مصنف لالہ کرپاشنکر جی کے جگانے کے بعد فوراً مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔

ہ) مصنف ایک پُرعزم شخصیت کے مالک تھے۔

۴۔ اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۵۔ لالہ کرپاشنکر جی کی شخصیت کے نمایاں پہلو بیان کریں؟

۶۔ اگر آپ مصنف کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

۷۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی ....لحاف کی اوٹ میں کر لیا اور پھر سوچنے لگے''۔

۸۔ درج ذیل الفاظ/تراکیب/محاورات کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

جل ترنگ ۔ اہلِ ذوق ۔ توپیں داغنا ۔ عدم تشدد ۔ سحر خیز ۔ جوشِ شباب ۔ آستینیں چڑھانا۔

اضطراب ۔ اولوالعزمی

طنز و مزاح

طنز: زندگی کے عیوب و نقائص، ماحول کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں، لوگوں کی انفرادی یا اجتماعی عادات، سیاسی، سماجی یا اقتصادی نظام کی کمزوریوں اور خامیوں کو مزاحیہ انداز میں اس طرح پیش کرنا کہ وہ لوگوں کو بُرا بھی نہ لگے؛ اور ان کے ذہن اِن خامیوں کی طرف متوجہ بھی ہو جائیں طنز کہلاتا ہے۔ ایک طنز نگار کا مقصد اصلاح ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کے ناسور پر طنز کے تیز نشتر چلا کر اِن سے فاسد مواد خارج کرتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے؛ کہ معاشرہ یا فرد اُس کے طنز کی بنا پر اپنی خامیوں اور برائیوں سے نجات حاصل کرے، طنز کہلاتا ہے۔

مزاح: مختلف کاموں میں یکسوئی اور انہماک سے مسلسل جُتے رہنے کی وجہ سے انسانی اعصاب تھک جاتے ہیں۔ اور جسم کے اعضا کمزوری محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح روزانہ گھنٹوں ایک ہی طرح کا کام کرتے رہنے کی وجہ سے ہمارا دماغ تھک جاتا ہے۔ اور ہم اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اِس اکتاہٹ کو رفع کرنے کے لیے کئی طریقوں میں ایک طریقہ مزاحیہ تحریروں کا مطالعہ بھی ہے۔ یہ مزاحیہ تحریریں دنیاوی اور کاروباری تفکرات سے ہماری توجہ ہٹا کر ہمیں شگفتگی اور تازگی کی فضا میں لے جاتی ہیں۔ مزاح کے ذریعے خوش طبعی، زندہ دلی، ذہنی چاشنی اور جودتِ طبع کا مظاہرہ کرکے پڑھنے والے کو ہنسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مزاح یا ظرافت کا مقصد کسی پر چوٹ کرکے اسے دکھ پہنچانا نہیں ہوتا۔ بلکہ بات کو اس انداز سے بیان کرنا ہے کہ سب سننے والے ہنس پڑیں لیکن کسی کو دکھ نہ ہو، مزاح کہلاتا ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کوئی تحریر اس کے ادبی محاسن (علم بیان، صنائع بدائع) کے حوالے سے پڑھوائیں اور ان سے عام اور ادبی تحریر میں تمیز کروائیں۔
۲۔ کوئی بھی مضمون اس کے اجزا اور خصوصیات، اصطلاحات اور تصورات کے حوالے سے سمجھ کر پڑھوائیں۔
۳۔ اُردو زبان کے کسی اور مزاح نگار کے نثری فن پارے کا پطرس بخاری کے کسی مضمون سے فنی محاسن کے حوالے سے موازنہ کروائیں۔
۴۔ پطرس بخاری کی کتاب ''مضامینِ پطرس'' سے کوئی اور مضمون طلبہ کو سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

اساتذہ کرام طلبہ کو طنز و مزاح کی نوعیت اور ماہیت سے آگاہ کریں۔
۱۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور اہمیت پر لیکچر دیں۔
۲۔ اُردو طنز و مزاح میں پطرس بخاری کے مقام سے آگاہ کریں۔
۳۔ پطرس بخاری کے اسلوبِ نثر کی فنی خوبیوں سے واقفیت دلائیں۔
۴۔

مشتاق احمد یوسفی

(حالاتِ زندگی)

مشتاق احمد یوسفی ۱۹۲۳ء میں ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں حاصل کی۔ بی۔اے آگرہ سے کیا۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم۔اے اکنامکس اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

ایک غیر ملکی بینک کی ذیلی شاخ میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے اور متعدد ملکی اور غیر ملکی بینکوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۴ء میں ایک نجی بینک کے صدر مقرر ہوئے۔ اُن کی ایک تصنیف "خاکم بدہن" پر انہیں آدم جی انعام بھی ملا۔

مشتاق احمد یوسفی نے زندگی کا بہ غور مشاہدہ کیا اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر کے اپنے زمانے کے ادبی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی موضوعات کو کہیں مزاح اور کہیں طنز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اُن کے تمام مضامین ہماری معاشرتی زندگی کے عنوانات ہیں۔ جس کو انہوں نے اپنی ذہانت اور بزجستگی سے طنز و ظرافت کے باوقار نمونے بنا دیے۔

یوسفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کا جو رنگ اختیار کیا۔ اس میں حقائق کی تلخیوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں کو طنز و مزاح کی چاشنی دے کر زیادہ مؤثر انداز میں پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہنسنا ہنسانا بھی ایک عبادت ہے لہٰذا طنز و مزاح کو وہ عبادت تصور کرتے ہیں۔

ان کی تحریروں کی خصوصیات میں عمدہ اور چست فقرے بعید از قیاس تشبیہات و استعارات، محاورات، ضرب الامثال اور مقبول اشعار کی ردوبدل سے مضحکہ خیز صورتحال پیدا کرنا شامل ہے۔ اُن کی تحریریں مسرت کا تاثر تو بخشتی ہیں، لیکن پھکڑ پن پیدا نہیں ہوتا۔ طنز و مزاح کی آمیزش ان کی تحریروں کو دہری کاٹ عطا کرتی ہے کہ نشانہ کوئی اور ہو اور چوٹ کسی اور کو لگے۔

مشتاق یوسفی کی تحریر میں لطیفہ گوئی دلچسپ صورت حال اور کرداری خاکوں کا کمال ہے۔ جملوں میں ذو معنویت مزاحیہ رنگ پیدا کرتی ہے۔ ان کے مزاح کا رنگ معنوی گہرائی نہ رکھنے کے باوجود دلچسپ اور پُرکشش ہے اس پُرکشش انداز اور لطیفہ گوئی کے پیرائے میں کبھی کبھی وہ معاشرتی ناہمواریوں پر گہرا طنز کر جاتے ہیں۔ ان کے کردار جیتے جاگتے اور ہماری روزمرہ زندگی میں ہمارے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی تصانیف میں چراغ تلے، آبِ گم، زرگزشت، شامِ شہر یاراں اور خاکم بدہن شامل ہیں۔ آپ نے ۲۰/جون ۲۰۱۸ء کو کراچی میں وفات پائی۔

سنہ

(مشتاق احمد یوسفی)

مقاصد تدریس

ا۔ طلبہ کو جدید اُردو ادب میں طنز و مزاح کی اہمیت سے روشناس کروانا۔
۲۔ طلبہ سے کسی بھی ادبی علمی، صحافتی موضوع پر درست لب و لہجے اور تلفظ کے ساتھ 10 منٹ سے زیادہ لکھی ہوئی تقریر کروانا۔
۳۔ مشتاق احمد یوسفی کے اُسلوبِ نگارش سے آگاہی دینا۔

خاص الفاظ و تراکیب: نپولین ۔ مشاہیرِ عالم ۔ میلبورن ۔ موقوف ۔ کلیدی ۔ حروفِ ابجد ۔ استخراج
لینن ۔ مجسم ۔ بن مانس ۔ قبل از مسیح

اوروں کا حال معلوم نہیں۔ لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔ اس کا قلق تمام عمر رہے گا جو راتیں سکھوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزریں وہ فقط لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔ محمود غزنوی لائقِ صد احترام سہی لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے بھی یہ شکایت رہی کہ سترہ حملوں کے بجائے اگر وہ جی کڑا کر کے ایک ہی بھرپور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتیں (ہمارا اشارہ مشکلات کی طرف ہے)

اولادِ آدم کے سر پر جو گزری اور گزر رہی ہے اس کی ذمہ داری مشاہیرِ عالم پر عائد ہوتی ہے یہ نری تہمت طرازی نہیں بلکہ فلسفہ تاریخ ہے۔ جس سے اس وقت ہمیں سروکار نہیں ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بنی نوع آدم کو تاریخ نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا؛ جتنا مؤرخین نے، انہوں نے اس کی سادہ اور مختصر سی داستان کو یادگار تاریخوں کا ایک ایسا کیلنڈر بنا دیا جس کے کبھی ہندسے سرخ نظر آتے ہیں۔ چناں چہ طلبہ بوجوہ معقول ان کے حق میں دعائے مغفرت نہیں کر سکتے اور اب ذہن بھی ان تعیناتِ زمانی کا اس حد تک خوگر ہو چکا ہے کہ ہم وجود انسانی کا تصور بلا قیدِ سن و سال کر ہی نہیں سکتے۔

جو سن نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے
جو ہم نہ ہوتے تو غم نہ ہوتے

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مؤرخین سن کو ایک طلسمی طوطا سمجھتے ہیں جس میں وقت کے ظالم دیو کی روح مقید ہے کچھ اسی قماش کے عقیدے پر میلبورن کے خضر صورت آرچ بشوت مانکس نے تین سال پہلے طنز کیا تھا کہ جب ان کی ۹۳ ویں سالگرہ پر ایک اخبار کے رپورٹر نے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے بڑے گمبیھر لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ کے نزدیک ۹۳ برس کی عمر تک پہنچنے کی اصل وجہ کیا ہے''؟

''برخوردار! اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا تھا''۔

اور کچھ مؤرخین پر موقوف نہیں۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں میٹرک کے امتحان سے کچھ دن قبل مرزا عبدالودود بیگ نے اس راز کو فاش کیا (ہر چند کہ طلبہ اسے کھولا نہیں کرتے) کہ شقی القلب ممتحن بھی سن ہی سے قابو میں آتے ہیں۔ چناں چہ زیرک طالب علم ہر جواب کی ابتدا کسی نہ کسی سن سے کرتے ہیں خواہ سوال سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ ذاتی مشاہدے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ ایسے ایسے غبی لڑکے جو نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی میں کبھی تمیز نہ کر سکے۔ اور آج تک چنگیز خاں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ محض اس وجہ سے فرسٹ کلاس آئے کہ انہیں قتل عام کی تاریخ اور پانی پت کی حافظہ شکن جنگوں کے سن از بر تھے۔ خود مرزا، میٹرک میں بس اس وجہ سے اول آ گئے کہ مرہٹوں کی تمام لڑائیوں کی تاریخیں یاد تھیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں مارچ کا مہینہ بے حد بہار آفریں ہوتا ہے۔ یہ وہ رُت ہے جس میں سبزہ اوس کھا کھا کر ہرا ہوتا ہے اور ایک طرف دامنِ صحرا موتیوں سے بھر جاتا ہے تو دوسری طرف

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال

اس تمہیدِ دل پذیر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں اس مست مہینے میں پت جھڑ ہوتا ہے اور۔

بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے کھاد

توجہ صرف اس امر کی جانب دلانا چاہتا ہوں کہ برصغیر میں یہ فصلِ گل آبادی کے سب سے معصوم اور بے گناہ طبقے کے لیے ہر سال نئے ذہنی کرب کا پیغام لاتی ہے، جس میں چار سال سے لے کر چوبیس سال کی عمر تک سبھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سالانہ امتحانوں کا موسم ہوتا ہے۔ خدا جانے محکمہ تعلیم نے اِس زمانے میں امتحانات رکھنے میں کون سی ایسی مصلحت دیکھی، ورنہ عاجز کی رائے میں اس ذہنی عذاب کے لیے جنوری اور جون کے مہینے نہایت مناسب رہیں گے۔

بات سے بات نکل آئی، ورنہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب جو پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو یک گونہ افسوس ہوتا ہے کہ عمرِ عزیز کی پندرہ سولہ بہاریں اور میوہ ہائے باغِ جوانی اسی سالانہ جانکنی کی نذر ہو گئے۔ یادش بخیر وہ سلونا موسم جس کو اگلے وقتوں کی زبان میں ''جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن'' کہتے ہیں، شاہ جہاں کے لڑکوں کی لڑائیاں اور فرانس کے تلے اوپر اٹھارہ لوئیوں کے سنِ ولادت و وفات یاد کرنے میں بسر ہوا اور تنہا فرانس کا کیا مذکور برطانیہ کی تاریخ میں بھی چھ عدد جارج، آٹھ آٹھ ایڈورڈ اور ہنری گزرے ہیں جن کی پیدائش اور تخت نشینی کی تاریخیں یاد کرتے کرتے زبان پر کانٹے اور حافظے میں نیل پڑ گئے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ تاریخی نام رکھنے اور تاریخِ وفات کہنے کا رواج اِسی مشکل کو حل کرنے کی غرض سے پھیلا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِن کی مدد سے حافظے کو ایسی تاریخیں یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے جن کا بھول جانا ہی بہتر ہوتا۔ بعض شعرا بہ نظر احتیاط ہر سال

اپنا قطعہ تاریخِ وفات کہہ کر رکھ لیتے ہیں تاکہ مرنے کی سند رہے اور وقتِ ضرورت پس ماندگان کے کام آئے۔ یہ کون واقف نہیں کہ مرزا غالب نے جو مرنے کی آرزو میں مرتے تھے متعدد بار اپنی تاریخ رحلت کہہ کر شاگردوں اور قرض خواہوں کو خواہ مخواہ ہراساں کیا ہوگا۔ لیکن جب قدرت نے ان کو مرنے کا ایک سنہری موقع فراہم کیا تو وہ یہ کہہ کر صاف ٹال گئے کہ وبائے عام میں مرنا ہماری کسرِ شان ہے۔

مارچ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ بی اے کے امتحان میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا میں روہیلوں کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر مرزا عبدالودود بیگ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ جھوم جھوم کر کچھ رٹ رہے ہیں۔ پوچھا "خیام پڑھ رہے ہو"۔

کہنے لگے "نہیں یہ تو ہسٹری ہے"۔

"مگر آثار تو ہسٹیریا کے ہیں!"

اپنی اپنی جگہ پر دونوں سچے تھے انہوں نے غلط نہیں کہا۔ اگرچہ میرا خیال بھی صحیح نکلا کہ وہ شعر سے شغل فرما رہے ہیں۔ البتہ شعر پڑھتے وقت چہرے پر مرگی کی سی کیفیت؛ میں نے قوالوں کے سوا کسی اور کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پھر خود ہی کہنے لگے "چلو ہسٹری کی طرف سے تو اب بے فکری ہوگئی۔ قبلہ نانا جان نے پچاس مشاہیر کی تاریخ ولادت و وفات کے قطعے کہہ کر میرے حوالے کر دیے ہیں ان میں آدھے حفظ کر چکا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے تیمور لنگ کی پیدائش اور رنجیت سنگھ کی رحلت کے قطعات بطور نمونہ گا کر سنائے۔

گھر پہنچ کر تخمینہ لگایا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فی کس دو قطعات کے حساب سے اس شاہنامہ ہند کے چار سو مصرعے ہوئے اور اس میں ذیلی قطعات شامل نہیں۔ جن کا تعلق دیگر واقعات و موضوعات مثلاً جانا پرتھوی راج کا سوئمبر میں بھیس بدل کر اور لے بھاگنا سنجوگتا کو گھوڑے پر۔ آنا نادر شاہ کا ہندوستان میں واسطے لینے کوہ نور ہیرا برابر انڈے مرغابی کے۔ داخل ہونا واجد علی شاہ کا پہلے پہل مٹیا برج میں۔ تاریخی چھٹ بھیوں (ثانوی ہیرو) مثلاً رانا سانگا، ہیموں بقال، نظام سقہ وغیرہ سے تھا۔

حالاں کہ دماغی طور پر میں پانی پت کی لڑائیوں میں بری طرح زخمی ہو چکا تھا لیکن آخری قطعہ کو سن کر میں نے اُسی وقت دل میں فیصلہ کرلیا کہ امتحان میں باعزت طریقے سے فیل ہونا اس اوچھے ہتھیار سے ہزار درجہ بہتر ہوگا۔ بہرحال مرزا نے ایک ہفتہ بعد اِس کلیدِ کامیابی کو امتحان میں بے دریغ استعمال کیا جس میں انہیں دو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی دشواری تو یہ کہ کاپی میں قطعات اور حروف ابجد کا حساب دیکھ کر کمرہ امتحان کا نگران، جو ایک مدراسی کرسچن تھا۔ بار باران کے پاس لپک کر آتا؛ اور سمجھاتا کہ اردو کا پرچہ کل ہے۔ مرزا جھنجھلا کر جواب دیتے کہ یہ ہمیں بھی معلوم ہے تو وہ نرمی سے پوچھتا کہ پھر یہ تعویذ کیوں لکھ رہے ہو۔ پایانِ کار مرزا نے وہیں کھڑے کھڑے اس فنِ تاریخ گوئی اور استخراجِ سنین کے رموز و نکات سے

غلط انگریزی میں آگاہ کیا۔ حیرت سے اس کا منہ سات کے ہندسہ کی مانند پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ حروف و اعداد کو بہکی بہکی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

''تعجب ہے کہ تم لوگ ماضی کے واقعات کا پتا بھی علومِ نجوم سے لگا لیتے ہو''۔

اس مجسم دشواری کے علاوہ دوسری دِقت یہ ہوئی کہ ابھی پانچوں سوالات کے جملہ بادشاہوں، راجاؤں اور جنگوں کے عدد اور سن بہ سہولت تمام نکلے بھی نہ تھے کہ وقت ختم ہوگیا اور نگران نے کاپی چھین لی۔ بڑی منت و سماجت کے بعد مرزا کو کاپی پر اپنا رول نمبر لکھنے کی اجازت ملی۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ مجھے سن یاد نہیں رہتا اور مرزا کو وہ واقعہ یاد نہیں رہتا جو اُس سن سے متعلق ہو فرض کیجیے مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ فرانسیسی انقلابیوں نے کسی صدی کے آخر میں قلعہ باستیل کا محاصرہ کیا تھا لیکن سن یاد نہیں آتا۔ اب مرزا کو یقیناً اتنا یاد ہوگا کہ ۱۷۸۹ء میں کچھ گڑ بڑ ضرور ہوئی تھی لیکن کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی یہ بغیر استخارہ کیے نہیں بتا سکتے۔

ایک مفکر کہتا ہے کہ عظیم انقلاب کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی تم دیکھو گے کہ زبردست تبدیلیاں ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں۔ تاریخی کیلنڈر میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ سب جانتے ہیں سکندر نے کس سن میں کون سا ملک فتح کیا لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ بن مانس کون سے سن میں انسان بنا۔ اتنا تو اسکول کے بچے بھی بتا دیں گے کہ سیفو کب پیدا ہوئی اور سقراط نے کب زہر کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگایا لیکن آج تک کوئی مورخ یہ نہیں بتا سکا کہ لڑکپن کس دن رخصت ہوا۔ جوانی کس رات ڈھلی۔ ادھیڑ پن کب ختم ہوا اور بڑھاپا کس گھڑی شروع ہوا''۔

سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کو یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں ''قبل از مسیح'' آتا ہے اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے شیشہ آسن کرنا پڑتا ہے جو اتنا ہی دشوار ہے جتنا الٹے پہاڑے سنانا۔ اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہئیے کہ تاریخ قبل از میلادِ مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔ اگر چہ مؤرخین کوشاں ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۳ ق م کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں۔ عقل مند استاد ان جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں۔ آگے چل کر جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق م میں فوت ہوا تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ حافظہ خراب ہو تو آدمی زیادہ عرصہ تک جوان رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وقت کا احساس بذاتِ خود

ایک آزار ہے جس کو اصطلاحاً بڑھاپا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے غلط نہیں کہا کہ "یوں تو مجھے دو بیماریاں ہیں۔ دمہ اور جلندھر لیکن تیسری بیماری لاعلاج ہے اور وہ ہے عمرِ طبعی"۔

میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ اگر سن پیدائش یاد رکھنے کا رواج یک گردش چرخِ نیلوفری اٹھ جائے تو بال سفید ہونے بند ہو جائیں گے یا کیلنڈر ایجاد نہ ہوا ہوتا تو کسی کے دانت نہ گرتے۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ جس شخص نے بھی ناقابلِ تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سیکنڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا اس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور موت کا ذائقہ چکھایا۔ وقت کو انسان جتنی بار تقسیم کرے گا زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز اور نتیجتاً موت اتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔ اب جب کہ زندگی اپنے آپ کو کافی کے چمچوں اور گھڑی کی ٹک ٹک سے ناپتی ہے تہذیب یافتہ انسان اس لوٹ کر نہ آنے والے نیم روشن عہد کی طرف پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہے جب وہ وقت کا شمار دل کی دھڑکنوں سے کرتا تھا اور عروسِ نو رات ڈھلنے کا اندازہ کانوں کے موتیوں کے ٹھنڈے ہونے اور ستاروں کے جھلملانے سے لگاتی تھی۔

نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمار وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو! ہو تمھیں انھیں سُجھاتے
کہ گئی ہے رات کتنی

(چراغ تلے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مصنف کے ایامِ جوانی کس طرح گزر گئے؟
ب) مصنف محمود غزنوی سے کیوں نالاں ہیں؟
ج) مصنف اولادِ آدم کی مصیبتوں کی ذمہ داری مشاہیر عالم پر کیوں ڈالتے ہیں؟
د) بقول مصنف اس کی کتنی بہاریں اس سالانہ جاں کنی کی نذر ہو گئیں؟
ہ) بقول مصنف مرزا عبدالودود بیگ امتحان میں کس طرح اول آئے؟
و) مصنف مارچ کے مہینے سے کیوں گھبراتا تھا؟
ز) مصنف کے خیال میں بعض شعرا کیوں ہر سال اپنا قطعہ تاریخ کہتے ہیں؟
ح) دورانِ امتحان ممتحن مرزا عبدالودود بیگ کے پاس بار بار کیوں آتا تھا؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ''سنہ'' صنفِ ادب کے لحاظ سے ایک مضمون ہے۔

i) طربیہ
ii) المیہ
iii) طنزیہ
iv) طنزیہ و مزاحیہ

ب) مضمون ''سنہ'' کا مصنف ہے۔

i) پطرس بخاری
ii) فرحت اللہ بیگ
iii) شفیق الرحمٰن
iv) مشتاق احمد یوسفی

ج) مضمون ''سنہ'' مشتاق احمد یوسفی کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

i) آبِ گم
ii) سرگزشت
iii) شامِ شہرِ یاراں
iv) چراغ تلے

د) بقول مرزا عبدالودود بیگ ممتحن متاثر ہوتے ہیں۔

i) سن لکھنے سے
ii) خوشخطی سے
iii) طویل جواب دینے سے
iv) مختلف رنگوں کے استعمال سے

ہ) مصنف پانی پت کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔

i) جسمانی طور پر
ii) نفسیاتی طور پر
iii) ذہنی طور پر
iv) معاشی طور پر

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) نالائق طلبہ صرف سن لکھنے سے فرسٹ آتے ہیں۔

ب) ترقی یافتہ ممالک میں مارچ کا مہینہ بے حد بہار آفرین ہوتا ہے۔

ج) مصنف آسانی سے سن یاد کرتے تھے۔

د) مرزا عبدالودود بیگ کو امتحان میں تین قسم کی دشواریاں درپیش تھیں۔

ہ) بقول مفکرِ عظیم انقلاب جلدی رونما ہو جاتا ہے۔

۴۔ متن کے مطابق درست الفاظ سے خالی جگہیں پُر کریں۔

الف) نانا جان نے پچاس مشاہیر کے تاریخ ولادت وفات کے قطعے یاد کرنے کے لیے .... کے حوالے کیے تھے۔

ب) امتحان کا نگران مرزا عبدالودود بیگ کے پرچے میں قطعات کو علم .... سمجھتا تھا۔

ج) مصنف کو سن جب کہ مرزا عبدالودود بیگ کو .... یاد نہیں رہتے تھے۔

د) عقل منداستاد، ان جاہلانہ سوالات کے جواب .... سے دیتے ہیں۔

ہ) حافظہ خراب ہو تو آدمی زیادہ عرصہ تک .... رہتا ہے۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں .... ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے''۔

۶۔ طنزیہ مزاحیہ مضمون ''سنہ'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۷۔ مضمون ''سنہ'' میں بیان کیے گئے تجربات میں سے اگر آپ بھی گزرے ہوں تو اِسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۸۔ آپ مضمون ''سنہ'' میں بیان کیے گئے مصنف کے خیالات سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟

۹۔ مضمون ''سنہ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۱۰۔ مضمون ''سنہ'' کی روشنی میں امتحانی نظام کا ایک تنقیدی جائزہ لیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی ادبی، علمی یا صحافتی موضوع پر درست لب و لہجہ اور تلفظ کے ساتھ دس منٹ سے زیادہ کی لکھی ہوئی تقریر دیکھ کر پڑھوائیں۔

۲۔ خاص علوم اور پیشوں کے اصطلاحی نکات کا استعمال کروائیں۔

۳۔ کمرہ جماعت میں مشتاق احمد یوسفی کا کوئی اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو ادب میں طنز و مزاح کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

۲۔ جدید اُردو ادب میں مشتاق احمد یوسفی کا مقام بتائیں۔

۳۔ مشتاق احمد یوسفی کے طرزِ تحریر پر لیکچر دیں۔

۴۔ طنز و مزاح کے سنجیدہ پہلوؤں سے آگاہ کریں۔

چراغ حسن حسرت

(حالاتِ زندگی)

چراغ حسن نام اور حسرت تخلص تھا۔ ۱۹۰۲ء میں کشمیر کے گاؤں بارہ مولا میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد ہندو تھے۔ آپ کے والد نے اسلام قبول کیا۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم والد سے حاصل کی۔ مگر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا اور پرائیویٹ طور پر پڑھتے رہے۔ شعروادب کا شوق اُنہیں بچپن ہی سے تھا۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز مدرسہ سے کیا۔ مگر جلد ہی ملازمت چھوڑ کر کلکتہ پہنچے۔ اور ''عصرِ جدید'' اخبار میں ملازم ہوگئے۔ مگر جلد ہی ترقی کرکے ایڈیٹر بن گئے۔ ''آفتاب'' کے نام سے اپنا ادبی پرچہ نکالا۔ جب کہ مالی مشکلات کے باعث بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد ''نئی دنیا''۔ ''زمیندار'' ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کی ادارت میں شامل رہے۔

دوسری جنگ عظیم میں فوج میں شامل ہوئے۔ اور میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلے اخبار ''امروز'' سے منسلک رہے اور بعد میں کچھ عرصے کے لیے ریڈیو پاکستان میں کام کیا۔ آخری عمر میں سفارت خانوں میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

حسرت بنیادی طور پر ایک بلند پایہ صحافی اور انشا پرداز ہیں۔ انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے اُردو صحافت کو بے حد فروغ دیا۔ اُن کی زبان سادہ، شستہ اور عام بول چال کی زبان ہے۔ انہیں مشکل الفاظ تکلف و تصنع اور آورد سے سخت نفرت ہے۔ وہ ہر بات کو کمالِ بے ساختگی سے کہنے کے عادی ہیں۔ ان کی تحریریں شگفتگی، اعتدال اور توازن کی عمدہ مثال ہیں۔

خاکہ نگاری میں اِنہیں کمال حاصل ہے۔ خاکہ نگاری میں ان کا فن نکھر آتا ہے اور وہ اپنے کردار کے مختلف حالات اور متضاد پہلو بیان کرکے اُس کی شخصیت کو اِس طرح اُجاگر کرتے ہیں؛ کہ ان کی عظمت کا ہمارے ذہنوں پر نقش ہوجاتی ہے۔

حسرت کا اصل میدان مزاح نگاری ہے۔ اور اُن کی مزاح نگاری، شخصیتوں کے خاکے، شگفتہ بیان اور ہلکی سی ادبی چاشنی سے جنم لیتی ہے۔ انہوں نے مولانا ظفر علی خان اور آغا حشر کے خاکوں میں جو رنگ بھرا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ تحریف کے ذریعے مزاح پیدا کرنا بھی حسرت کی اہم خصوصیت ہے۔ حسرت نے نظم و نثر دونوں میں تحریف نگاری کی شان دار مثالیں پیش کیں۔ ۱۹۵۵ء میں لاہور میں وفات پائی۔

آغا حشر

(چراغ حسن حسرت)

مقاصدِ تدریس

۱۔ اُردو ڈراما نگاری میں آغا حشر کاشمیری کے مقام سے آگاہ کرنا۔
۲۔ چراغ حسن حسرت کے اُسلوبِ نثر سے واقفیت دلانا۔
۳۔ طلبہ کو رموزِ اوقاف کے درست استعمال سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ سے کسی بھی تخلیقی سبق کی مشق کرانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

کلے ٹھلے ۔ دیدارُو ۔ سہم جانا ۔ وارد ہونا ۔ ہینگ ۔ قدرشناس ۔ خوام۔ گیسو ۔ ایکٹر ۔ موجِ زمزم۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلی مرتبہ آغا حشر کا نام کب سنا؟ صرف اتنا یاد ہے کہ ''ڈراما'' کا نام سننے سے پہلے اس نام سے میرے کان آشنا ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوا کہ آغا حشر جو کچھ کہتا ہے اس کا نام ڈراما ہے۔ ڈراما کی اصل حقیقت کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ ڈراما اور ڈرانا کے معنی میں بہت تھوڑا فرق ہوگا۔

ہمارے پڑوس میں ایک افغان سردار رہتے تھے۔ ان کا ایک نوکر تھا جسے سب ''آغا آغا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ بڑے کلے ٹھلے کا دیدارو جوان تھا۔ سیاہ گنجان داڑھی۔ زلفیں چھٹی ہوئیں وہ جدھر سے گزرتا تھا۔ لڑکے ''آغا آغا'' کہہ کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے۔ وہ اکثر اوقات تو ہنستا ہوا گزر جاتا لیکن کبھی کبھی لڑکوں کے نعرے سن کے چلتے چلتے رک جاتا۔ اپنی زبان میں چلا چلا کے کچھ کہتا اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کر ہماری طرف اس طرح دیکھتا کہ سب سہم جاتے۔

انہیں دنوں ہمارے قصبے میں ایک اور آغا وارد ہوئے۔ یہ ہینگ بیچنے آئے تھے۔ لمبی داڑھی، بال شانوں پر بکھرے ہوئے، صدری پر میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالے سڑک پر کھڑے رہتے اور ''اینگ لے لو۔ اینگ لے لو'' پکارا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی کسی شخص کو ان سے ہینگ خریدتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کے چلا چلا کر کچھ کہتے۔ غالباً بستی کے لوگوں کو جن میں کوئی ہینگ کا قدر شناس نہیں تھا۔ گالیاں دیتے ہوں گے۔ اس عالم میں کوئی شخص آنکلتا تو اسے پکار کر کہتے ''خو! اینگ لے لو'' اگر وہ چپ چاپ گزر جاتا تو کچھ دیر تک جھک کر خاموش ہو رہتے ورنہ اگر جواب میں کہتا کہ مجھے ہینگ کی ضرورت نہیں تو چلا کے فرماتے ''خوام تمھارے باپ کا نوکر ہے کہ تمھارا واسطے اتنی دور سے اینگ لایا۔ اینگ لے لو۔ ام

سے مسخری مت کرو"۔

غرض آغا، حشر اور ڈراما تینوں لفظ میرے نزدیک بہت ڈراؤنے اور بھیانک تھے اور انہوں نے میرے ذہن پر کوئی خوشگوار اثر نہیں چھوڑا۔

پھر جب ہمارے ہاں ایک "ڈرامیٹک کلب" کی بنیاد پڑی اور "اسیر حرص" "سفید خون" "خواب ہستی" "ہملٹ" کے نام ہر شخص کی زبان سے سنائی دینے لگے تو آغا حشر کا نام بھی بار بار زبانوں پر آنے لگا۔ اس دورافتادہ مقام میں لے دے کے یہی ایک تفریح تھی اس لیے بوڑھے، بچے، جوان سب تھیٹر دیکھنے جاتے تھے۔ مستری خدابخش سے جو تھیٹر کے پردے بھی بناتے تھے اور میلوں میں اپنا ہنڈولا لے کر بھی پہنچ جاتے تھے، سہیلیوں تک جن میں اکثر سکول کے بھاگے ہوئے لڑکے تھے، میں سب کو جانتا تھا لیکن اُن میں آغا حشر کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آغا حشر پردوں کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس کا سر چھت سے لگا ہوا ہے۔ لمبی داڑھی ہے۔ لمبے بال کمر تک پہنچتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں بھنگ کی گٹھڑی ہے۔ دوسرے میں جادو کا ڈنڈا۔ اسی کے حکم سے پردے اٹھتے اور گرتے اور ایکٹر بھیس بدل بدل کر نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ خیال آیا کہ کسی طرح پردے کے پیچھے جا کر اس کی ایک جھلک دیکھ لوں لیکن پھر ہمت نہ پڑی۔

پنجاب میں اگرچہ تھیٹر، نے چنداں ترقی نہیں کی اور یہاں منشی غلام علی دیوانہ اور ماسٹر رحمت کے کینڈے کے لوگ اس فن میں سند الوقت سمجھے جاتے تھے لیکن ۱۹۲۱ء میں جب مجھے پہلی مرتبہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو یہاں آغا حشر کی شاعری کی دھوم تھی۔ جن لوگوں نے انہیں انجمن حمایت اسلام میں نظمیں پڑھتے دیکھا تھا وہ ان کے انجمن کے جلسے میں آتے اور نظم سنانے کی کیفیت اس ذوق شوق سے بیان کرتے تھے گویا کربلائے معلیٰ کے محرم کا حال بیان کر رہے ہیں۔ "موجِ زمزم" اور "شکریہ یورپ" کے اکثر اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے اور انہیں آغا کی طرح مٹھیاں بھینچ کر گونجیلی آواز میں پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تھے

اگرچہ آغا اپنے عروجِ شباب کے زمانے میں صرف ایک مرتبہ پنجاب آئے لیکن ان کا یہ آنا عوام وخواص دونوں کے حق میں قیامت تھا۔ یعنی جو ثقہ حضرات ڈراما کو بدوضع اور آوارہ لوگوں سے مخصوص سمجھتے تھے ان کی رائے اس فن کے متعلق بدل گئی اور کیوں نہ بدلتی؟ اسی گروہ کے ایک شخص نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسہ میں، جو اُن دنوں ایک قومی میلہ سمجھا جاتا تھا، ایسی نظم پڑھی کہ روپے پیسے کا مینہ برس گیا۔ اور جو کام بڑے بڑے عالموں سے نہ ہوسکا اس نے کر دکھایا۔

میں ۱۹۲۵ء میں کلکتہ گیا تو آغا صاحب کلکتہ چھوڑ کر مہاراجہ ٹکاری کے ہاں جاچکے تھے۔ لیکن ان کے ہزاروں مداح ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کلکتہ میں موجود تھے۔ ان کی زبانی آغا کی زندگی کے اکثر واقعات ان کے لطیفے، اشعار، پھبتیاں سنیں۔ کوئی سال بھر کے بعد ایک دن کسی نے آ کر کہا کہ آغا آئے ہیں۔ فائن آرٹ پریس والے لالہ برج لال اروڑا آغا کے بڑے

عقیدت مند تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ''آغا آ گئے۔ ان سے کب ملوائیے گا''؟ وہ کہنے لگے۔ ابھی چلو نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں نے رسالہ ''آفتاب'' کے کچھ پرچے بغل میں دبائے۔ لالہ برج لال نے ٹوپی ٹیڑھی کر کے سر پر رکھی اور بخطِ مستقیم آغا کے ہاں جا پہنچے۔ وہ ان دنوں سکی سٹریٹ میں رہتے تھے۔ بڑا وسیع مکان تھا۔ ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہی صحن تھا۔ اس کے دہنے بائیں کمرے۔ لالہ برج لال نے ان کے نوکر سے پوچھا ''آغا صاحب کہاں ہیں''؟ اُس نے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ صحن سے ملا ہوا ایک وسیع کمرہ تھا۔ اس میں ایک چارپائی پر آغا صاحب صرف لنگی باندھے اور ایک کرتا پہنے لیٹے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ہینگ والے آغا اور اس آغا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سر پر انگریزی فیشن کے بال، داڑھی منڈی ہوئی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، دُہرا جسم، سرخ و سفید رنگ، درمیانہ قد، ایک آنکھ میں نقص تھا، محفل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پہلے لالہ برج لال سے خیر و عافیت پوچھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور ادبی ذکر واذکار چھڑ گئے۔

آغا صاحب نے اگرچہ ہزاروں کمائے اور لاکھوں اُڑائے لیکن ان کی معاشرت ہمیشہ سیدھی سادی رہی۔ مکان میں نہ نفیس قالین تھے نہ صوفے نہ کوچ، نہ ریشمی پردے نہ غالیچے۔ نفیس کپڑے پہننے کا بھی شوق نہ تھا۔ گھر میں ہیں تو لنگی باندھے ایک بنیان پہنے، کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ باہر نکلے ہیں تو ریشمی لنگی اور لمبا کرتا پہن لیا۔ میں نے پہلی مرتبہ انہیں اسی وضع میں دیکھا اور زندگی کے آخری ایام میں جب لاہور آئے ان کی یہی وضع تھی۔ ہاں اکثر لوگوں سے اتنا سنا ہے کہ لاہور آنے سے پہلے وہ کلکتہ میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔

آغا بڑے حاضر جواب اور خوش طبع شخص تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے سب پر چھا جاتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں اکثر لوگ ضلع جگت میں طاق اور پھبتی میں مشاق تھے۔ اور جب شام کو صحبت گرم ہوتی، تین تین چار چار آدمی مل کے آغا پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھ دیا کرتے تھے لیکن آغا چوکھی لڑنا جانتے تھے۔ حریف دم بھر میں ہتھیار ڈال دیتا لیکن آغا کی زبان نہ رکتی تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بانکا پھکیت سروہی کے ہاتھ پھینکتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کمر کو بتا کے سر پر وار کیا۔ کبھی پالٹ کا ہاتھ مارا۔ کبھی دہنے سے کبھی بائیں سے۔ اِس فن میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔

وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ادنیٰ قسم کے بازاری ناولوں اخباروں رسالوں سے لے کر فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کی اعلیٰ تصانیف تک سب پر ان کی نظر تھی۔ اور فضل بک ڈپو سے دارالمصنفین تک وہ سارے اداروں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ کلکتہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ سہ پہر کو گھر سے نکلے اور بخطِ مستقیم اخبار ''عصر جدید'' کے دفتر میں پہنچے۔ پہلے سارے اخبار پڑھے۔ پھر رسالوں کی نوبت آئی۔ کبھی ریویو کے لیے کوئی کتاب آ گئی، تو وہ بھی آغا صاحب کی نذر ہوئی۔ کچھ اخبار اور رسالے تو وہیں بیٹھے

بیٹھے دیکھ لیے، جو بچ رہے، انہیں گھر لے گئے۔ بازار میں چلتے چلتے کتابوں کی دکان نظر آگئی۔ کھڑے ہو گئے۔ اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کے بغل میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں کسی کتاب کا کوئی گرا پڑا ورق دکھائی دیا تو اسے اٹھالیا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالا۔ نوکر بازار سے سودا سلف لے کر آیا ہے۔ بنیے نے اخباروں اور کتابوں کے اوراق میں پڑیاں باندھ کے دی ہیں۔ یکا یک آغا صاحب کی نظر پڑ گئی۔ نوکر سے پوچھ رہے ہیں۔ اس پڑیا میں کیا ہے؟ شکر! اچھا شکر ڈبے میں ڈالو۔ پڑیا خالی کر کے لاؤ۔ اسے کہیں پھینک نہ دیجیو۔ یہ بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ خدا جانے کسی اخبار کے ورق ہیں یا کتاب کے۔ بہرحال مجھے ان پر شبلی کا نام لکھا نظر آیا ہے۔

مطالعے سے ان کے اس شغف کا حال سن کر شاید بعض لوگوں کا خیال ہو کہ آغا نے بہت بڑا کتب خانہ جمع کرلیا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ چھوڑ ان کے ہاں دس پانچ کتابیں بھی نہیں تھیں۔ ایک تو ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتے تھے تو اسے دوسری مرتبہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ دوسرے ان کی طبیعت علائق سے گھبراتی تھی۔ کتابیں سینت سنبھال کے رکھنے کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔ ان کا تو بس یہ حال تھا کہ کتاب آئی۔ پڑھ کے مکان کے کسی گوشے میں ڈال دی کوئی ملنے والا آیا اور اٹھا کے لے گیا۔

یہ اسی مطالعے کی برکت تھی کہ ان کی معلومات پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ طب ہو یا فلسفہ۔ شاعری ہو یا ادب۔ کسی موضوع میں بند نہیں تھے اور جہاں علم ساتھ نہیں دیتا تھا وہاں ان کی ذہانت آڑے آجاتی تھی۔ بازار سے نئی جوتی منگوائی ہے کسی نے پوچھا آغا صاحب کتنے کو مول لی ہے؟ بس آغا صاحب نے جوتی کے فضائل اور محاسن پر تقریر شروع کردی۔ چمڑے کی مختلف قسموں، دباغت کے طریقوں، جوتی کی وضع قطع ایک ایک چیز پر اس تفصیل سے بحث کر رہے ہیں گویا کسی نہایت اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو سننے والوں کو یہ احساس تھا کہ آغا صاحب کی جوتی کو سچ مچ تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

آغا مناظرہ کے میدان کے شیر تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے۔ سب پر چھا جاتے تھے۔ باقاعدہ تعلیم تو واجبی تھی، لیکن مطالعے نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ایک دن میں نے کہا آغا صاحب جی چاہتا ہے آپ کے سوانح حیات لکھ ڈالوں۔ کہنے لگے میرے سوانح حیات میں کیا پڑا ہے؟

بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وطن میں ان پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ امرتسر اٹھ آئے۔ وہاں سے والد مرحوم شالوں کی تجارت کے سلسلہ میں بنارس پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ ہر چند انہوں نے میری تعلیم میں سعی کی لیکن جی نہ لگا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر چھوڑ دیں۔ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے اور مجھے ملائے مکتبی بنانا چاہتے تھے لیکن مجھے ملائیت سے نفرت تھی۔ ابھی

مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ بنارس سے بھاگ کر بمبئی پہنچا۔ وہاں پارسیوں نے تھیٹر کا ایسا طلسم باندھ رکھا تھا کہ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس پر غش تھے۔ میں نے بھی ڈراما لکھنے کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک دو ڈرامے لکھ کر شکسپیئر پر ہاتھ صاف کیا۔ اگرچہ ان دنوں بمبئی میں بڑے بڑے انشا پرداز اور شاعر موجود تھے لیکن خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں میں سب گرد ہوگئے۔ لو میرے سوانح حیات کا بہت بڑا حصہ تو چند لفظوں میں ختم ہوگیا۔

اکثر لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی کہ آغا خود اپنی تعریفیں کرتے ہیں اور اپنے سامنے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں لیکن آغا صاحب کا خیال تھا کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی تعریف کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی اخبار میں میری ایک نظم جو غالباً عید کے متعلق تھی شایع ہوئی۔ آغا نے اخبار دیکھا تو نظم کی بڑی تعریف کی۔ خصوصاً آخری شعر کئی مرتبہ پڑھا اور پھر بولے ''اماں؛ تم بہت خوب کہتے ہو۔ اس سے اچھا کوئی کیا کہے گا؟'' میں نے کہا آغا صاحب آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں؟ میں کیا اور میری نظم کیا؟ کہنے لگے۔ کیا کہا؟ ہم تعریف کرتے ہیں اور تم اپنی برائی سننا چاہتے ہو۔ اچھا صاحب۔ یوں ہی سہی۔ نظم بہت بری ہے۔ تم نے جھک مارا جو یہ نظم لکھی اور ہم نے جھک مارا جو تمھاری تعریف کی۔ کہو کہو۔ اس ہیچ مدان، پنبہ دان، کج مج زبان، حقیر فقیر سراپا تقصیر کو کیا شعور ہے کہ نظم لکھ سکے۔ حضور کی ذرہ نوازی ہے۔ اور سیدھی سادی زبان میں یہ مضمون ادا کرنا چاہو تو کہو میں نے یہ نظم نہیں لکھی اور تم جھوٹے ہو جو اس کی تعریف کر رہے ہو، ارے بھائی؛ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تمھارے انکسار کا یہی حال رہا تو فاقے کرو گے۔ سینہ تان کے کیوں نہیں کہتے کہ جی ہاں، میری نظم تعریف کے قابل ہے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ ''ترکی حور'' لکھ کے رستم جی کو سنایا۔ سب نے واہ واہ کی۔ لیکن سرگوشیاں بھی برابر ہو رہی تھیں۔ حریف اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو ایسی اکھیڑ ماریں کہ آغا چاروں شانے چت جا گرے۔ اتنے میں کڑک کے کہا۔ کون ہے جو آج ایسا ڈراما لکھ سکے؟ یہ سن کے سب کے سر جھک گئے۔ اور ہر طرف سے آوازیں آئیں۔ پیر و مرشد بجا و درست۔

آغا سے یہ بات سن کے مجھے ہمیشہ کے لیے کان ہوگئے۔ اگرچہ میں ان کی طرح اپنی تعریفیں آپ نہیں کرتا لیکن کوئی تعریف کرے تو یہ بھی نہیں کہتا کہ حضرت میں تو بالکل جاہل ہوں۔

آغا ہاتھ کے سخی تھے اور دل کے صاف۔ ان کے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ تھیٹر کے ایکٹروں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے لے کر بڑے بڑے اہلِ علم تک سب سے ان کی بے تکلفی تھی اور وہ ان سب سے بڑے خلق اور مروت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آغا محمود کو یہ بات ناگوار تھی کہ آغا چھوٹی امت کے لوگوں سے کیوں بے تکلفی سے ملتے ہیں لیکن اُن کے جن لوگوں سے جس قسم کے تعلقات تھے، انہیں مرتے دم تک نبھائے چلے گئے اور وضع داری میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ہر شخص سے اُس کی لیاقت اور مذاق کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ عالموں میں بیٹھتے ہیں تو حدوث وقدم مادہ کے

متعلق گفتگو ہو رہی ہے یا احادیث کی حیثیت پر بحث کر رہے ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور آریہ سماج کے اصولوں پر تقریریں کی جا رہی ہیں۔ ایکٹروں میں جا پہنچے تو ضلع جگت شروع ہو گئی۔ پھبتیاں کہی جا رہی ہیں۔ قہقہے اڑ رہے ہیں۔

آغا نے اگرچہ لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی اڑائے لیکن وہ تنہا خوری کے عادی نہیں تھے۔ جب روپیہ آتا تھا اس میں سب عزیزوں کے حصے لگائے جاتے تھے۔ قریب کے رشتہ داروں کو تو انہوں نے ہزاروں لاکھوں دے ڈالے۔ والدہ کی ایسی خدمت کی کہ کوئی کیا کرے گا لیکن دور کے رشتہ داروں کو بھی وہ کبھی نہ بھولے۔ ان کے عزیزوں میں کئی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے تھے۔ اُن سب کے درماہے مقرر تھے۔ روپیہ آتا تھا تو جس کا جو حصہ مقرر تھا اسے گھر بیٹھے پہنچ جاتا تھا۔ غرض آغا کی ذات کئی بیکسوں کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ان کے اٹھتے ہی یہ سہارا مٹ گیا۔

آغا کے کلام اور ان کے ڈراموں پر تبصرہ کرنا میرا فرض نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا وہ شعر بہت جلد کہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے بعد اگر میں نے کسی کو اس قدر جلد شعر کہتے دیکھا تو وہ آغا تھے۔ ڈراموں کا بھی یہی حال تھا اصل میں انہیں لکھنے سے نفرت سی تھی۔ عمر بھر کبھی کسی کو خط کا جواب نہیں دیا اور جواب دیا بھی تو اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔

کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ میں نے ایک مصرع پڑھا۔ انہوں نے برجستہ دوسرا مصرع کہہ دیا۔ اور چند منٹوں میں غزل ہو گئی۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص سرمستی اور جوش ہے جو اردو میں ان کے سوا کسی کے ہاں نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا اثر ان کے ڈراموں پر بھی پڑا ہے۔ یعنی جس طرح غزل میں ہر شعر مستقل حیثیت رکھتا ہے اسی طرح ان کے ڈراموں کے مختلف اجزا تو اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن آپس میں مل کر وہ اپنا حسن کسی حد تک کھو بیٹھے ہیں۔ گویا یوں کہنا چاہیے کہ آغا کے ڈراموں کا حسن اجزا میں ہے کُل میں نہیں۔ اِسی مفہوم کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مکان کا گارا، چونا، اینٹیں اور لکڑی تو اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں لیکن جب ان سے مل کر مکان بنتا ہے تو اس میں بہت سے نقص نظر آتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اردو ڈرامے کو بہت اونچے مرتبے پر پہنچا دیا اور اس معاملے میں اُن کا کائی حریف نہیں تھا۔

وہ خود بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ میں لوگوں کے مذاق کو ملحوظ رکھ کر ڈرامے لکھتا ہوں ورنہ اگر میں عوام کے مذاق کی پروا نہ کر کے اپنے اصلی رجحانِ طبیعت کے مطابق کچھ لکھوں تو اور ہی عالم نظر آئے۔ میں نے ایک مرتبہ کہا کہ آغا صاحب آپ اپنی طبیعت کے حقیقی جوش کو ظاہر کیوں نہیں ہونے دیتے اور عوام کے مذاق کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں؟ یہ سن کر آغا کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ اور کہنے لگے کہ اگر میں اپنی طبیعت کے صحیح رجحان کی پیروی کرتا تو جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ وہ تو بڑی خیر گزری کہ میں نے زمانے کی نبض کو پہچان لیا۔ لوگوں کے مذاق کے مطابق ڈرامے لکھتا ہوں۔ اور موٹروں میں اڑا پھرتا ہوں۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں آغا حشر نکاری سے کلکتہ آئے ہوئے تھے کہ ایک دن میں ان سے ملنے گیا پہلے تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کہنے لگے ارے میاں اس اخبار نویسی میں کیا پڑا ہے؟ اِسے چھوڑو اور میرے ساتھ نکاری چلو۔ ڈراما لکھنے میں برق نہ کردوں تو میرا ذمہ۔ میں نے اس وقت تو کہہ دیا کہ اچھا آغا صاحب یوں ہی سہی۔ مگر گھر آ کے سوچا تو خیال آیا کہ اب تو آغا صاحب سے نیاز مندانہ تعلق ہے۔ ملازمت کا قصہ ہوگا تو اور بات ہو جائے گی۔ کیا عجب کہ کسی بات پر ان سے بگڑ جائے اور جو صاحب سلامت آج ہے یہ بھی نہ رہے لیکن مشکل یہ تھی کہ آغا سے اقرار کر چکا تھا اب انکار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اتفاقاً اسی درمیان کچھ ایسے پیچ پڑے کہ میں نے کلکتہ چھوڑ لاہور آنے کا تہیہ کرلیا۔ چلنے سے پہلے ایک دن آغا سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے نکاری چلتے ہونا؟ میں نے کہا۔ میں تو لاہور جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے۔ میرے ساتھ لاہور اور لاہور کے اخباروں اور اخبار نویسوں کو بھی لے ڈالا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اٹھ کر چلا آیا۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ آغا نکاری چلے گئے۔

کوئی سات سال کے بعد آغا سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ میں حکیم فقیر محمد مرحوم کے ہاں ملنے گیا تو چھ سات آدمیوں میں گھرے بیٹھے تھے لیکن میں نے بالکل انہیں نہیں پہچانا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے۔ گالوں میں گڑھے، ہڈیاں نکلی ہوئیں، گردن کا گوشت لٹکا ہوا۔ پہلے کچھ دن حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ پھر شہر کے باہر ایک کوٹھی کرایہ پر لی اور وہاں اٹھ گئے۔ میں کبھی کبھی وہاں جاتا تھا۔ اگرچہ اب بھی ان کی طبیعت اور وضع داری کا وہی عالم تھا لیکن جہاں انہیں امراض نے آگھیرا تھا وہاں طبیعت میں وہ اگلی سی جودت بھی نہیں رہی تھی۔

ایک دن میں میکلوڈ روڈ سے گزر رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ مڑ کر دیکھتا ہوں کہ آغا صاحب ایک دکان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ یہاں کہاں'' فرمانے لگے۔ ''موٹر خراب ہوگئی ہے۔ اس کی مرمت کرانے یہاں بیٹھا ہوں''۔ پھر بولے ''یہ کیا حرکت ہے۔ تم ہمارے ہاں آتے کیوں نہیں'' میں نے کہا ''آغا صاحب فرصت نہیں ملتی''۔ بولے ''چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ ہم مرجائیں گے تو افسوس کرو گے؛ کہ آغا سے اس کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی نہ ملے''۔ میں نے کہا ''آغا صاحب کل ضرور حاضر ہوں گا''۔ فرمانے لگے۔ ''آج تو میں امرتسر جا رہا ہوں۔ پرسوں واپس آجاؤں گا۔ مجھے فون کرلینا''۔

دوسرے دن فون کیا تو معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی نہیں آئے۔ تیسرے دن، رات کے وقت کسی نے کہا؛ کہ آغا صاحب سخت بیمار ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو ان سے ملنا مناسب نہیں۔ صبح چلیں گے۔ صبح میں اٹھ کر کپڑے پہن رہا تھا۔ اتنے میں خبر ملی کہ آغا کا انتقال ہوگیا ہے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ جنازہ شہر میں لایا جائیگا۔ اخباروں میں یہ خبر بھی چھپی کہ نیلے گنبد میں نماز جنازہ ہوگی۔ لیکن پھر خدا

جانے کیا ہوا؛ کہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ سوسوا سو آدمی تھے۔ ان میں بھی یا تو ان کی فلم کمپنی کے لوگ تھے؛ یا بعض خاص نیاز مند کوئی دس بجے جنازہ اٹھا اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

(مردم دیدہ)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) لوگ اینگ خریدنے کے لیے کیوں آمادہ نہیں ہو رہے تھے؟

ب) مصنف کے زمانے میں لوگ تھیٹر کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟

ج) مصنف نے اپنے ذہن میں آغا حشر کا کیا خاکہ تیار کیا تھا؟

د) ڈرامے کے بارے میں ثقہ حضرات کی رائے کس طرح بدل گئی؟

ہ) پہلی ملاقات میں آغا حشر نے مصنف کو کس طرح متاثر کیا؟

و) آغا حشر کاشمیری کس قسم کی کتابیں پڑھتے تھے؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) آغا حشر کاشمیری کے بزرگ.......... رہنے والے تھے۔

i) دہلی کے
ii) لاہور کے
iii) کلکتہ کے
iv) بارہ مولہ

ب) آغا حشر کاشمیری نے نام پیدا کیا تھا۔

i) ڈراما میں
ii) افسانہ میں
iii) ناول میں
iv) شاعری میں

ج) ''فوجِ زمزم'' اور ''شکریہ یورپ'' آغا حشر کاشمیری کے مشہور۔

i) ڈرامے ہیں
ii) نظمیں ہیں
iii) افسانے ہیں
iv) انشائیے ہیں

د) سبق ''آغا حشر'' صنف ادب کے لحاظ سے ہے۔

i) ڈراما ii) افسانہ

iii) خاکہ iv) آپ بیتی

د) آغا حشر کی معلومات پر لوگوں کو ہوتی تھی۔

i) حیرت ii) پریشانی

iii) سنجیدگی iv) حسد

۳۔ سبق کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) آغا حشر کاشمیری کے ہاں ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔

ب) آغا حشر کامیابی کے لیے خود اپنی تعریف ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

ج) آغا حشر کے جاننے والوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔

د) آغا حشر کاشمیری دہلی میں دفن ہیں۔

ہ) آغا حشر شعر بہت جلد کہتے تھے۔

۴۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''آغا بڑے حاضر جواب اور.................. ان کا کوئی حریف نہیں تھا''۔

۵۔ سبق کے مطابق آغا حشر کاشمیری کا ظاہری خدوخال بیان کریں۔

۶۔ سبق پڑھنے کے بعد آپ نے آغا حشر کاشمیری کی شخصیت کیسے پائی۔

۷۔ سبق آغا حشر کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۸۔ آغا حشر کے زمانے میں پنجاب میں تھیٹر کی حالت کیسی تھی؟

رموزِ اوقاف

''رموز'' رمز کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں اشارہ یا علامت۔ اور ''اوقاف'' وقف کی جمع ہے۔ جس کے معنی ٹھہرنا یا رُکنا۔

تعریف: وہ اشارے یا علامتیں جو کسی عبارت کے ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصے کو اس کے باقی حصوں سے الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اصطلاح میں رموزِ اوقاف کہلاتی ہیں۔

علاماتِ وقف

۱۔ ختمہ (۔) یہ علامت ایک مکمل جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہیں۔ یہاں کچھ ٹھہرنا ہوتا ہے۔

۲۔ سوالیہ (؟) یہ علامت سوالیہ جملوں کے آخر میں لگائی جاتی ہے تاکہ ایک عام جملے اور سوالیہ جملے میں امتیاز پیدا ہو جائے۔
۳۔ سکتہ (،) یہ ایسی علامت ہے جس میں ہلکا سا توقف کر کے آگے جانا ہوتا ہے۔
۴۔ تفصیلہ (:۔) یہ علامت کسی چیز کی تفصیل کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔
۵۔ قوسین ( ) قوسین یا خطوط وحدانی میں عبارت کے ایسے حصے لکھے جاتے ہیں۔ جو جملہ معترضہ کے طور پر آتے ہیں۔
٦۔ واوین (" ") یہ علامت کسی دوسرے کی تحریر کا اقتباس یا کسی کا قول پیش کرتے وقت اس کے شروع اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔
۷۔ ندائیہ (!) یہ علامت تب استعمال کی جاتی ہے جب کسی کو متوجہ کرنا مقصود ہو۔
۸۔ وقفہ (؛) یہ علامت سکتے سے زیادہ دیر ٹھہرنے کے لیے ہوتی ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی علمی، ادبی یا صحافتی موضوع پر ان کے مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی روشنی، استدلال، دُرست تلفظ اور عمدہ لب ولہجہ کے ساتھ پانچ منٹ تک زبانی تقریر کروائیں۔
۲۔ طلبہ سے کسی بھی تخلیقی سطح کی تحریر (ڈائری، رپورٹ، انشائیہ، کہانی، افسانہ، غزل، نظم وغیرہ) کو مناسب تربیت/ اصلاح کے بعد پیش کروائیں۔
۳۔ طلبہ کو آغا حشر کاشمیری کے کسی ڈرامے کے مکالمے سنوائیں۔
۴۔ چراغ حسن حسرت کا کوئی اور خاکہ کمرہ جماعت میں سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے طریقے سے آگاہ کریں۔
۲۔ اُردو نگاری میں آغا حشر کاشمیری کے مقام سے واقفیت دلائیں۔
۳۔ اُردو ادب میں چراغ حسرت کے مقام پر لیکچر دیں۔
۴۔ چراغ حسن حسرت کے اُسلوب نثر کے فنی محاسن بتائیں۔

فرحت اللہ بیگ

(حالاتِ زندگی)

مرزا فرحت اللہ بیگ کے آباؤ اجداد بدخشاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے دادا کو مغل فرمانروا اکبر شاہ ثانی نے گورنر جنرل کے دربار میں اپنا بااختیار نمائندہ مقرر کیا تھا۔ اس اعتبار سے ان کے خاندان کا دلی کے معزز اور اہم گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔

فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دس برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی میں حاصل کی۔ پھر سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہوئے۔ اُسی زمانے میں اُنہوں نے مولوی نذیر احمد سے عربی پڑھی۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کے بعد ملازمت کی تلاش شروع ہوئی۔ تلاشِ معاش کے سلسلے میں پہلے رام پور گئے۔ پھر الہ آباد اور آگرہ کے چکر کاٹے۔ آخر حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں اُن کا خاندان مقیم تھا۔

۱۹۰۷ء میں چادر گھاٹ ہائی سکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ پھر مقابلے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ جس کی بنا پر اسپیشل مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ پھر ترقی کر کے ہائی کورٹ کے رجسٹرار اور ہوم سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور اِسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایسے دور میں ہوش سنبھالا۔ جب سماجی قدریں تبدیل ہو رہی تھیں۔ پرانی تہذیب کم و بیش ختم ہو رہی تھی؛ اور نئی تہذیب اپنے قدم جما رہی تھی۔ فرحت نے پرانی دہلی کی یادگاروں کو اپنے مضامین میں محفوظ کر لیا۔

وہ اُردو کے عظیم مزاح نگار تھے۔ اُن کی تحریروں میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اُن کی خوش بیانی کی وجہ سے اُن کا طنز بھی خوشگوار ہوتا ہے۔ اِس میں تیز کاٹ نہیں ہوتی۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ زبان کے لطف، واقعات اور محاورات کے استعمال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان کی شگفتگی، گھلاوٹ اور مزاحیہ رنگ سے اُن کی تحریر میں دلچسپی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔

فرحت کی زبان نرم و نازک ہے۔ جس میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ صاف ستھری اور بامحاورہ زبان لکھنے میں اُنہیں بڑی قدرت حاصل ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان میں لطیف مزاحیہ نگاری کی کمی محسوس کر کے اِسے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اور ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے ایک سلسلہ جاری کیا۔ جو اب کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ شاعری کے میدان میں بھی جولانی دکھائی ہے۔ ''میری شاعری'' کے نام سے ایک دیوان شائع ہوا۔ ''دہلی کا یادگار مشاعرہ'' اور ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں دکن حیدرآباد میں وفات پائی۔

ایک وصیت کی تعمیل

(فرحت اللہ بیگ)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے فن سے روشناس کروانا۔
۲۔ طویل متنوں کی تلخیص سے روشناس کرانا۔
۳۔ فرحت اللہ بیگ کی شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے طرز سے آگاہ کرنا۔
۴۔ کسی موضوع کے حق یا مخالفت میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی مشق کرانا

خاص الفاظ و تراکیب

نگینہ ۔ راس نہ آنا ۔ تیر قضا کا ۔ بن بلائے مہمان ۔ یورش ۔ علمی مباحث ۔ غل غپاڑہ
قطعہ تاریخ ۔ شانِ نزول ۔ صراحت

میں مدت سے حیدر آباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انہیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گزشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں، کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل ابھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے گپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، سیام فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پانجامہ، کتھی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا امیر حبیب اللہ خان اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہو گئیں، اس وقت انہوں نے فرمایا۔ میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اِسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا''۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے، مرجائیے مضمون میں لکھ دوں گا''۔

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مرجائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحیدالدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی۔ وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انہوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سو گئے ہم دونوں نے باتوں میں صبح کردی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحاتِ زبان اردو پر بحث ہوتی رہی، شعروشاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں، مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کردی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے، پھبتیاں اڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی، ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک ہی غل غپاڑہ رہا۔

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند بند رہے، لیکن آخر میں بالکل کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا۔ لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کرلیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی، اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کس کے سامنے کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ اِدھر سے اُدھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا، جو سچے دل سے اُن کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔

بات یہ ہے کہ انہوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں اٹھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہوجائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر اِن مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ

لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا، انہوں نے ہر دفعہ یہی کہا۔ ''ارے میاں! گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا، اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے، سرسید کی خدمت میں سر گاڑی پاؤں پہیہ کیا، اب جو چند روپے مل رہے ہیں، تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے''۔

میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے، بہت ہے۔ ''آگے ناتھ نہ پیچھے پگا''۔ مزے کیجیے۔ بہت گئی ہے، تھوڑی رہی ہے، ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے''۔

وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے، ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی، اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔ جتنی اُن کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اُتنی ہی اُن کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا۔ جب اُن کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب' آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے ہی کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اِس کی صراحت، میں آگے چل کر، کروں گا۔ ہاں، ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کھتے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے۔ اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہر حال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا، اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستے کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہو گئی، بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا، تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔

دوسرے روز ان کا لیکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی، پھر بھی بڑے میاں کو جوش آ گیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ٹوپی نکالی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لیکچر

دینے کا دم نہ تھا، اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ انہوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے پیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لیکچر پڑھنا شروع کیا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے مگر مولوی صاحب کے طرزِ ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ اُن کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے۔ یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ کئی برس گزر چکے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لیکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا، میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لیکچر انہیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو یہ لیکچر پڑھتے پڑھتے خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو، اس میں ان کا مدِ مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اُسی روز ایک واقعہ پیش آیا کہ اُس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ ''۱۲۶۱ء میں دہلی کا ایک مشاعرہ'' اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے، اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا ''یارو! ذرا جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، مزا کِرکِرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں، تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا، میں اپنی اسپیچ ختم کر دوں گا''۔ اتنا کہہ کر میں فوراً باہر پردے کے سامنے آگیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کروں۔

جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مولف ''طبقات الشعرائے ہند'' سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انہی کے مکان پر نواب زین العابدین خان کی مدد سے ہوا تھا۔ چناں چہ میں نے اپنے لیکچر کی ابتدا میں اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے

دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا۔ پھر اُن کے دہلی میں آ کر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اِس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا اس میں جمع ہوئے۔

میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا۔ کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنے پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی، اب جو ہے، وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے۔ ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟''

مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اینٹھتے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے۔ کہنے لگے۔ ''فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا''۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں؟ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا۔ جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے کہا۔ ''مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا، دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے کہاں کے تھے، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں، کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے''؟

کہنے لگے۔ ''تو گھڑی گھڑی، ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا''۔ مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کر لیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے''؟

بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے، ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا۔ ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟'' یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے۔ ''جی ہاں' میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے''۔

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے۔ ہائے اُن کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر

خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال، نہ بچہ، نہ نوکر، نہ ماما۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آتی۔ ''کون؟''

میں نے کہا۔ ''فرحت''۔ اُسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑ تک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھر بار کا خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے، چائے بنائی، نمک کے ڈالے کو ڈال، دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے۔

کبھی بھی گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں، کہنے لگے ''نہیں بھئی، میں نے تو مدّتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے۔

تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی، پی لی۔ اِدھر اُدھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے، بان کی کُھری چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔

اُن کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ، اُس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے۔ کسی کے پاس بھی ہو، سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے بھی یار، دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی

ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے جاتے، انہی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس اِنہیں کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر اُن ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوج داری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ باید وشاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انہوں نے شعر پڑھا، اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود اُن کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس شاعر کا، اب بھلا ایک ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈنے بیٹھے اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے، اور اس اصل کے کیا معنے ہیں؟ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انہوں نے اِس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، انہیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہ رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحیدالدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا، ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اِسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں، جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتے۔

مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اُس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اُڑ واڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ اُن کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد لکھ رکھیں کہ چاہے اِس سرے سے اُس سرے تک، ہندوستان چھان مارو، مولوی وحیدالدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، اُن کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

(مضامین فرحت)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مولوی وحیدالدین سلیم سے پہلی ملاقات کے وقت مصنف کیوں پریشان تھا؟

ب) مولوی صاحب، فرحت سے ملاقات کا اشتیاق کیوں رکھتے تھے؟

ج) مولوی صاحب اخراجات میں اتنے محتاط کیوں ہو گئے تھے؟

د) اورنگ آباد پہنچنے پر مصنف اور مولوی وحیدالدین سلیم کا کیسا استقبال ہوا؟

ہ) مصنف نے مولوی صاحب کی کن خوبیوں کا ذکر کیا ہے؟

و) سبق میں مولوی صاحب کی کونسی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے؟

ز) مصنف نے مولوی وحیدالدین سلیم کے گھر کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے؟

ح) فرحت کی وجہ سے مولوی صاحب کے بارے میں کیا غلط فہمی پھیل گئی؟

ط) مولوی وحیدالدین اصلاح سازی میں کس زبان کے اصولوں سے مدد لیتے تھے؟

۲۔ سبق کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' کا مصنف ہے۔

i) فرحت اللہ بیگ   ii) فارغ بخاری

iii) چراغ حسن حسرت   iv) پطرس بخاری

ب) بقول مصنف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولوی وحیدالدین سلیم ہوتے چلے گئے۔

i) سخی   ii) ظالم

iii) کنجوس   iv) رحم دل

ج) مولوی وحیدالدین صاحب یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔

i) علی گڑھ   ii) عثمانیہ

iii) دہلی   iv) پنجاب

ج) مولوی صاحب مصنف کے ایک ۔۔۔ سے بہت خوش ہوئے تھے۔

i) نظم
ii) غزل
iii) خاکہ
iv) قطعہ تاریخ

د) مولوی وحید الدین اور مصنف دونوں ۔۔۔ رہنے والے تھے:

i) حیدر آباد کے
ii) دہلی کے
iii) میرٹھ کے
iv) کلکتہ

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) مصنف کے ساتھ سفر میں مولوی وحید الدین سلیم مسلسل خاموش رہے۔

ب) مصنف اور مولوی وحید الدین سلیم کے درمیان سفر کے چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔

ج) مولوی وحید الدین سلیم صاحب اولاد تھے۔

د) مولوی وحید الدین سلیم محاورات وضع کرنے میں لاثانی تھے۔

ہ) مصنف اور مولوی وحید الدین دونوں ایک ہی شہر حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔

۴۔ متن کے مطابق خالی جگہ درست لفظ سے پُر کریں۔

الف) مولوی وحید الدین سلیم کو .... کا بڑا شوق تھا۔

ب) مولوی وحید الدین صرف .... سے ڈرتے تھے۔

ج) دورانِ سفر مصنف اور مولوی صاحب کے ساتھ .... تھے۔

د) بقول مصنف مولوی صاحب میں .... کا مادہ بہت تھا۔

ہ) مولوی عبدالحق نے مصنف اور مولوی صاحب کو .... شہر آنے کی دعوت دی تھی۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع .... بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے''۔

۶۔ خاکہ ''ایک وصیت کی تعمیل'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۷۔ مصنف اور مولوی وحیدالدین سلیم کی پہلی ملاقات کا منظر اپنے الفاظ میں لکھیں۔
۸۔ مصنف نے جس طرح ظریفانہ اور نرم انداز میں مولوی وحیدالدین سلیم کی خامیوں کو اُجاگر کیا ہے کیا آپ اس سے اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟
۹۔ اگر آپ مصنف کی جگہ ہوتے تو مولوی وحیدالدین سلیم کا خاکہ کس طرح کھینچتے؟

شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری

خاکہ کے معنی ''کسی چیز کا ڈھانچہ'' اور ''تصویر کی ابتدائی اور بنیادی لکیریں'' کے ہیں۔ اُردو ادب کی اصطلاح میں خاکہ وہ مختصر تحریر یا مضمون ہے جس میں کسی شخص کی شخصیت اور کردار کی بھرپور جھلک نظر آئے۔

خاکہ دراصل اُس شخص کی شکل وصورت اور کردار ونظریات کی ایک قلمی تصویر ہوتی ہے۔ ایک کامیاب اور اچھے خاکے کی تحریر کے مطالعہ کے بعد ہم کسی شخصیت کے ظاہری و باطنی پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ خاکے کو عام طور پر کسی شخصیت کا ایک مختصر اور ہلکا ادبی تعارف نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

سرگرمیاں

۱) اساتذہ کرام طلبہ سے طویل مضمون کی تلخیص کرائیں یا بطور خلاصہ ان سے مختلف سوالات کے جوابات لکھوائیں۔
۲) مباحثوں/ مذاکروں/ سیمیناروں میں شریک کروائیں اور کسی موضوع کے حق یا مخالفت میں دلائل اور آداب کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کروائیں۔
۳) فرحت اللہ بیگ کا کوئی اور خاکہ کمرہ جماعت میں سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو شخصیت نگاری/ خاکہ نگاری کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔
۲۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی اہمیت بتا دیں۔
۳۔ فرحت اللہ بیگ کے اسلوبِ تحریر پر لیکچر دیں۔
۴۔ اُردو ادب میں فرحت اللہ بیگ کے مقام سے آگاہ کریں۔

فارغ بخاری

(حالاتِ زندگی)

سید میر احمد شاہ بخاری اصل نام اور فارغ بخاری قلمی نام ہے۔ فارغ تخلص کرتے ہیں۔ آپ کا آبائی وطن پشاور ہے جہاں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک، منشی فاضل، ادیب فاضل اور پشتو فاضل کے امتحانات پشاور سے پاس کیے۔ پشتو، اُردو اور فارسی تینوں زبانوں میں فضیلت کی سندیں حاصل کیں۔

پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ مگر چوں کہ شعروادب سے اُنہیں فطری لگاؤ ہے۔ اس لیے اُن کا بیش تر وقت ادبی خدمات میں گزرتا ہے۔ کئی اخبارات و رسائل کے مدیر رہے۔ اِس سلسلے میں وہ ''المشرق'' ماہنامہ ''نغمہ'' ''حیات'' ''کیسر کیاری'' پشاور سے اور اخبار ''شباب'' لاہور سے نکالتے رہے۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے اپنے شفیق دوست رضا ہمدانی کی معیت میں پشاور سے معیاری جریدہ ''سنگِ میل'' نکالا۔ جو آزادی رائے کے جرم میں حکومت نے بند کر دیا۔ اور ایک سال تک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں رہے۔

شاعری میں حبیب بینک ادبی انعام ملا۔ جب کہ ۱۹۹۳ء میں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی ملا۔

فارغ بخاری پاکستان کے نوجوان شعرا بالخصوص خیبر پختونخواہ کے سخنوروں میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ اُن کی شاعری کی ابتدا ۱۹۴۵ء سے ہوئی۔ وہ بلاشبہ لائقِ ستائش ہے۔ فارغ بخاری نظم و غزل دونوں کہتے تھے۔ نظموں میں وہ بالعموم رومانی اور انقلابی نظمیں کہتے ہیں۔ تاہم اُن کی رومانی نظموں میں ایک انقلابی بانکپن پایا جاتا ہے۔ جس کا رشتہ کبھی اختر شیرانی کی رومانیت سے تو کبھی جوش کی رومانوی انقلابیت سے جا ملتا ہے۔

اُنہوں نے بے شمار انقلابی گیت لکھے۔ مگر وہ انقلابی موضوعات کو اپنی غزلوں میں فنکارانہ اسلوب کے ساتھ نبھا نہ سکے اور اُن کی اکثر غزلیات خطابت کا شکار ہو گئی ہیں۔

اُن کی انقلابی منظومات میں ایک طرف تو مزدور طبقہ کے جذبات کا احترام ہے۔ اور دوسری طرف اُن جذبات کی ایسی پُرخلوص اور ولولہ انگیز ترجمانی پائی جاتی ہے۔ جو اِن تخلیقات کو ایک زندگی، ایک ولولہ اور ایک عزم سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ان خصوصیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی انقلابی نظمیں حسن و تاثیر کے زیور سے بھی آراستہ ہو گئیں۔

آپ نے ۱۹۹۷ء میں وفات پائی۔

تیسری قسم کا بچہ

(فارغ بخاری)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو ادب میں فنِ خاکہ نگاری کی اہمیت سے روشناس کروانا۔
۲۔ خاطر غزنوی کے فن سے آشنا کروانا۔
۳۔ طلبہ کو خاکہ نگاری اور آپ بیتی میں فرق سکھانا۔
۴۔ اُردو خاکہ نگاری/تحقیق نگاری میں فارغ بخاری کے مقام سے آگاہ کرنا۔
۵۔ آپ بیتی اور روداد نویسی سے روشناس کرانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: سعادت مند ۔ قناعت ۔ سفاک دور ۔ اغلباً ۔ ہرفن مولا ۔ جاں کھپانا ۔ کمیابی
اُجلے گیت ۔ شبنم کی پھوار ۔ نغمگی

سعادت مند بچے ایک ہی کھلونے سے کھیلتے کھیلتے سارا بچپن گزار دیتے ہیں۔شریر بچوں کے لیے اِدھر کھلونے آئے اور اُدھر توڑ پھوڑ کر نئے کھلونوں کا تقاضا شروع کر دیا۔ خاطر غزنوی کی خاصیت ان دونوں قسم کے بچوں سے جُدا ہے۔ وہ تیسری قسم کا ایسا بچہ ہے جو ایک کھلونے پر قناعت نہ کرتے ہوئے نت نئے کھلونوں کا متلاشی تو ضرور رہتا ہے لیکن انہیں توڑنے پھوڑنے کی بجائے شوکیس میں سجا کر رکھنے اور آنے جانے والوں سے اپنی ہنرمندی کی داد کا طالب ہوتا ہے۔

خاطر سے کم و بیش تیس برس پہلے میری ملاقات ہوئی تو وہ بچہ ہی تھا۔ عمر کے لحاظ سے نہ سہی ادبی طور پر اُن دنوں وہ گھٹنوں چلنے کی مشقت سے گزر رہا تھا۔ شاید اس لیے اب جب کہ وہ ادبی طور پر بھی کل کا باپ بن چکا ہے اس کی ادبی صلاحیتوں اور نام و مقام کا قائل ہوتے ہوئے بھی وہ مجھے بچہ ہی لگتا ہے۔ ویسے اُس میں بچوں کی بعض روایتیں ابھی تک بحال ہیں۔ بعض شخصیتوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر اسٹیج میں بچے ہی لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑھاپے کا سنگین اور سفاک دور بھی ان سے بچپنا نہیں چھین سکتا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ بڑھاپے میں انسان بچہ بن جاتا ہے۔ اغلباً ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر کہا ہوگا ورنہ ہر شخص میں یہ جوہر کہاں کہ وہ بڑھاپے کو بچپنے کی طرح گزارنے کا اہل ہو۔ اس عمر میں تو بقول جوش ملیح آبادی اپنی پہچان تک مشکل ہو جاتی ہے۔

؎ کیا قہر ہے جب دیکھتا ہوں آئینہ
اپنے میں کوئی اور نظر آتا ہے

خاطر کے کمرے کی بے ترتیبی دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی بچے نے کھیلنے کے لیے دنیا بھر کی بیکار چیزیں جمع کر رکھی ہوں۔ کتابوں، رسالوں، اخباروں کے علاوہ پرانے ٹکٹوں کے فائل، پرانی ڈائریاں، پرانے کیلنڈر، کیمرے، تصویریں، مجسمے یہاں تک کہ اس کے نام آئے ہوئے خطوط کے ادبی لفافوں کا انبار بھی آپ کو مل جائے گا۔ اس طرح ہرفن مولا بننے کے لیے ان میں اُس نے مصوری، فوٹوگرافی، شاعری، ڈراما نگاری، موسیقی غرض ہرفن میں نہ صرف قسمت آزمائی کی ہے بلکہ برسوں جان کھپائی ہے اور بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ لیکن ابھی تک اُس کے اندر کے قدآور فن کار پر کوئی جامہ فٹ نہیں آیا۔ پچھلے سال اس نے کہا تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ کر صرف شاعری کو اپنا رہا ہے۔ لیکن اِس کے ایک ہفتے بعد وہ ہندکو فلم قصہ خوانی میں اداکاری کے جوہر دکھاتا ہوا پکڑا گیا۔

دراصل وہ ایک ایسا سیماب صفت انسان ہے جو صرف بھاگ دوڑ کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس کی زندگی میں ٹھہراؤ مطلق نہیں۔ اپنے درس و تدریس کے فرائض کے علاوہ وہ درجنوں ادبی و غیر ادبی اداروں کا صدر، سیکرٹری، کنوینر، مشیر یا کم از کم ممبر ضرور ہے۔ صبح سے شام تک مشین کی طرح کام کرنا اُس کی محبوب ہابی ہے لیکچرر کے علاوہ وہ یونیورسٹی میں پبلک ریلیشن افسر بھی ہے اور غالباً لیکچررز کلب کا سیکرٹری بھی ہے۔ کیوں کہ اسے دعوتوں کا انتظام کرتا ہوا بھی پایا گیا۔ اور لیکچررز کے لیے حکومت سے رہائشی پلاٹوں کی زمین حاصل کرنے میں سرگرداں دیکھا گیا ہے۔ اس کے انکار کے باوجود یہ سارے دھندے اس کے گلے ڈال دیے جاتے ہیں۔ اور وہ اخلاقاً قبول کرنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے الیکشن میں ہمارے سیاست دان پبلک کے اصرار پر حصہ لینے کے لیے بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس میں اتنی قوت کار ہے کہ انکار کے باوجود پانچ دس اور بھی ایسی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے ہر وقت مجبور ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بلکہ ایک نہیں دو لطیفے یاد آرہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا وہ قصہ خوانی میں اپنے ایک دوست کی دکان پر بیٹھا تھا۔ دوست کسی کام سے اٹھ کر باہر گیا۔ اور حسب عادت دوکان داری میں دلچسپی لینے لگا۔ اسی اثنا میں دکان کے باہر ایک شخص اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ خاطر نے ایک ماہر دکاندار کی طرح پوچھا۔ کیا چاہیے؟ وہ قریب ہو کر کہنے لگا۔ چاہیے تو کچھ نہیں ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ کا کوئی بڑا بھائی ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کتنی عجیب بات ہے میرے بچے کا چینی کا پروفیسر ہو بہو آپ کی شکل کا ہے''۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اس کے ایک نئے شاگرد نے کلاس سے باہر خاطر کو اردو میں بات چیت کرتے ہوئے دیکھا تو حیران ہو کر اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ''اِسے جانتے ہو یہ چینی ہے اور دیکھو کیسی صاف اردو بول رہا ہے''۔
چینی ڈیپارٹمنٹ کے تعلق سے بعض حضرات اُسے واقعی چینی سمجھتے ہیں۔ وہ چینی تو نہیں لیکن اُس کی باتوں میں چینی کی

مٹھاس ضرور ہے۔ اس لیے چینی کی اِس کمیابی کے دور میں اِس کا دم غنیمت ہے۔ اِس کی باتوں میں نہیں۔ شاعری میں بھی ایک شیریں اور خوشگوار فضا ملتی ہے۔ خاطر نے بڑے اُجلے گیت کہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جذباتی ہونے کے باوجود شاعری میں اس کا لہجہ نرم اور کومل ہے۔ جیسے شبنم کی پھوار جیسے غنچے کے چٹکنے کی صدا جیسے ٹھنڈے صاف پانی کے جھرنے کی گنگناہٹ...... مصوری میں بھی اسے ہمیشہ ہلکے رنگ ہی مرغوب رہے ہیں۔ اس کے مزاج اور فن کا یہ تضاد ناقابلِ فہم ہے۔ ویسے اس کی شاعری کے متعلق ابتدا ہی سے۔ میری رائے ہے کہ وہ گیتوں کا شاعر ہے۔ اس کی نظموں، غزلوں میں بھی گیتوں ہی کا ذائقہ، نغمگی اور خوشبو ملتی ہے۔ وہ پھولوں اور خوشبوؤں کا شاعر ہے۔ وہ اب تک رنگارنگ تتلیوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ خوبصورت تتلیاں ہمیشہ اس کی رسائی سے دور رہی ہیں اس المیہ کو اس نے جان کا روگ نہیں بنایا بلکہ ایک اونچے فن کار کی طرح اپنے فن میں سمو کر اس میں جاذبیت اور دل کشی پیدا کی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کے فن کی تمام خوبیوں کا احاطہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں احباب کی رائے میں وہ تمام فنون لطیفہ پر ہاتھ مارنے کے بجائے کسی ایک کو اپناتا تو اس کی صلاحیتیں نہ جانے کہاں جا کر دم لیتیں، لیکن ”کسی ایک چیز“ کے متعلق ان کی رائے میں اختلاف ہے کوئی اسے مصوری کوئی فوٹو گرافی کوئی موسیقی اپنانے کا مشورہ دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں خاطر کا اصل میدان شاعری ہے۔ یہ اس کی طلسمی شخصیت کا جادو ہے کہ اس کے متعلق لوگ اتنی ساری خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن شاید وہ بھی جانتا ہے کہ اسے صرف شاعری کرنی چاہیے۔ ہاں منہ کا مزہ بدلنے کو کبھی کبھار کوئی دوسرا ذوق بھی پورا کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

خاطر کے قلم میں قوت ہے اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ اس کا مصرف بھی جانتا ہے۔ دوسرے فنون میں دسترس رکھتے ہوئے بھی اب تک اس نے صرف شاعری ہی میں نام پیدا کیا ہے۔ اس کی شاعری کے ضمن میں میں نے پھولوں اور تتلیوں کا ذکر کیا ہے یہ اس کے بچپن کے وہ سہانے خواب ہیں جن کا تعاقب کرتے ہوئے عمر کے اس حصے میں آ پہنچا ہے، جس میں حسینوں سے قابلِ احترام رشتے قائم کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ طویل تعاقب لڑکپن کی معصومیت اور ذہنی نیک چلنی کی علامتیں ہیں۔ اس کی یہ نیک چلنی خواہ مجبوری کے باعث ہی کیوں نہ ہو فنی نشوونما کے لیے کوئی نیک فال نہیں تاہم خاطر کی شخصیت کو نکھارنے میں اس کے چہرے کی معصومیت کے عنصر کا بڑا عمل دخل ہے۔ اندر کا حال تو اللہ جانتا ہے۔ اللہ کرے وہ اپنی طفولیت کی اس معصومیت کو محفوظ رکھ سکے اور اس کی وہ دائمی مسکراہٹ زندہ رہے۔ تاکہ ہم اس کی بعض بے ہودگیوں کے باوجود اسے ہمیشہ سویٹ چائلڈ کہتے رہے۔

(ہم قلم)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) ''بڑھاپے میں انسان بچہ بن جاتا ہے''، سے مصنف کی کیا مُراد ہے؟

ب) مصنف خاطر غزنوی کو گیتوں کا شاعر کیوں سمجھتے تھے؟

ج) بقول مصنف احباب خاطر غزنوی کو تمام فنون لطیفہ کی بجائے کسی ایک کو اپنانے کا مشورہ کیوں دیتے تھے؟

د) خاطر غزنوی کی شخصیت کے بارے میں کوئی لطیفہ بیان کریں۔

ہ) ''وہ چینی نہیں لیکن اس کی باتوں میں چینی کی مٹھاس ضرور ہے''، سے مصنف کی کیا مراد ہے؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) خاطر غزنوی رہنے والے تھے۔

i) پشاور کے ii) لاہور کے
iii) کراچی کے iv) کوئٹہ کے

ب) مصنف خاطر غزنوی کا اصل میدان سمجھتے تھے۔

i) مصوری کو ii) موسیقی کو
iii) شاعری کو iv) ڈراما نگاری کو

ج) ''تیسری قسم کا بچہ''فنِ ادب کے لحاظ سے ہے۔

i) انشائیہ ii) خاکہ
iii) آپ بیتی iv) خودنوشت

د) خاطر غزنوی ایک انسان تھے۔

i) متحرک ii) ہمدرد
iii) خاموش iv) سفاک

ہ) خاطر غزنوی پیشے کے لحاظ سے تھے۔

i) ڈاکٹر ii) دکاندار
iii) لیکچرر iv) پروڈیوسر

۳۔ متن کے مطابق دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) خاطر غزنوی پاکستانی زبانوں کے علاوہ روسی زبان بھی بولتے تھے۔

ب) خاطر غزنوی کی شخصیت کے مختلف پہلو تھے۔

ج) خاطر غزنوی فنِ تاریخ نویسی کے بہت بڑے ماہر تھے۔

د) خاطر غزنوی ایک سماجی شخصیت کے مالک تھے۔

ہ) خاطر غزنوی نے اداکاری بھی کی۔

۴۔ سبق ''تیسری قسم کا بچہ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''دراصل وہ ایک ایسا سیماب صفت .... مشین کی طرح کام کرنا اُس کی محبوب ہابی ہے''۔

۶۔ ''تیسری قسم کا بچہ'' پڑھنے کے بعد آپ نے خاطر غزنوی کی شخصیت کو کیسا پایا؟

۷۔ خاطر غزنوی کی شخصیت میں موجود مختلف متضاد پہلوؤں کا ایک دوسرے سے موازنہ کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مختلف قسم کے ادبی و علمی تحریریں پڑھوا کر اس قسم کی تحریریں خود اُن سے لکھوائیں۔

۲۔ طلبہ سے مختلف اقسام کے فارم پُر کروائیں اور رسیدیں لکھوائیں۔

۳۔ فارغ بخاری یا کسی اور شخصیت نگار کا کوئی خاکہ سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو اُردو ادب میں فنِ خاکہ نگاری کی اہمیت بتائیں۔

۲۔ خاکہ نگاری اور آپ بیتی میں فرق بتائیں۔

۳۔ اُردو صنف خاکہ نگاری/شخصیت نگاری میں فارغ بخاری کا مقام بتایا جائے۔

۴۔ فارغ بخاری کے اسلوبِ نثر کے فنی محاسن پر لیکچر دیا جائے۔

"حصہ غزل"

علامہ محمد اقبال

(حالاتِ زندگی)

علامہ محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ جو سیالکوٹ میں کشمیری شالوں اور ٹوپیوں کی تجارت کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مسجد میں حاصل کی۔ مشن سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا اور اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ و فلسفہ کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے لیکچرار مقرر ہو گئے۔

1905ء میں مزید تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے۔ وہاں سے بیرسٹرایٹ لاء (Barrister-at-Law) اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفہ پڑھاتے رہے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر وکالت کرنے لگے۔ حکومت برطانیہ نے انہیں "سر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں اپنا تاریخی خطبہ دیا۔ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا۔ جس کی بنا پر اُنہیں پاکستان کے تصور کا خالق اور قومی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

شاعر کی حیثیت سے اقبال کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُن کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ لہٰذا اُن کا کوئی شعر مقصدیت سے خالی نہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اُنہوں نے مسلمانانِ عالم بالخصوص مسلمانانِ ہند کو اُخوت، علم اور خودی کا درس دیا۔

اقبال کی اکثر غزلوں اور نظموں میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔ اُن کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت اِن کا ترنم ہے۔ اِس مقصد کے لیے اُنہوں نے مترنم اور رَواں دواں بحروں کا انتخاب کیا۔ سوز و گداز اُن کے کلام کو اور بھی دل آویز بنا دیتا ہے۔ موسیقیت کے لیے تکرارِ لفظی اور ہم آواز الفاظ کے استعمال سے بھی خوب کام لیا ہے۔

کلامِ اقبال کی ایک اور نمایاں خوبی نئی نئی اور خوبصورت تراکیب ہیں۔ یہ تراکیب اقبال کی اپنی ایجاد ہیں۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے۔ وہ خودی کے استحکام کے لیے عشق کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

بانگِ درا، بالِ جبریل، پیامِ مشرق، ضربِ کلیم، اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم اور جاوید نامہ ان کی مشہور تصانیف میں شامل ہیں۔

عمر کے آخری حصے میں بیمار رہے اور ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پائی اور بادشاہی مسجد کے احاطے میں دفن ہیں۔

غزل

(علامہ محمد اقبال)

مقاصدِ تدریس

۱۔ اُردو غزل گوئی کی تاریخ میں شاعر مشرق کا مقام بتانا۔
۲۔ شاعرِ مشرق کی اُردو غزل گوئی کے فنی محاسن بتانا۔
۳۔ صنائع و بدائع سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ سے کسی غیر مطبوعہ یا تکنیکی (کمپیوٹر) متن لکھوانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

سوئے کوفہ ۔ کشاد ۔ فاش ۔ رموزِ قلندری ۔ خانقا ۔ رِشی ۔ برہمن کا طلسم
عصا ۔ کلیمی ۔ فرنگ

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

یہ مدرسہ، یہ جواں یہ سُرور و رعنائی
اِنہیں کے دم سے ہے مئے خانہ فرنگ آباد

نہ فلسفی سے نہ مُلا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشۂ نظر کا فساد

فقیہہ شہر کی تحقیر، کیا مجال میری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقا ہو آزاد

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

(کلیاتِ اقبال)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) پہلے شعر کے مطابق شاعر ''اہلِ نظر'' سے کیا مراد لیتے ہیں؟

ب) مئے خانہ فرنگ کس طرح آباد رہتا ہے؟

ج) تیسرے شعر میں شاعر کو کن کن سے فساد کا اندیشہ رہتا ہے اور کیوں؟

د) رموزِ قلندری سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ہ) فقیہہ شہر کی تحقیر شاعر کے لیے کیوں مشکل ہے؟

۲۔ غزل کے مطابق درج ذیل میں دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) آباد، فساد، بغداد استعمال ہوئے ہیں بطور۔

i) قافیہ ii) تشبیہ

iii) استعارہ iv) ردیف

ب) ''عصا'' صفت ہے۔

i) مبالغہ ii) تجنیس

iii) تلمیح iv) تضاد

ج) شاعر فلسفی کو سمجھتا ہے۔

i) دل کی موت ii) نظر کا فساد

iii) ایک راہنما iv) ایک عالم

د) خانہ فرنگ سے مراد ہے۔

i) علمی ادارے ii) خانقاہیں

iii) تفریح گاہیں iv) انگلستان

۳۔ درج ذیل کی مختصر وضاحت کریں۔

رِشی کے فاقے ۔ برہمن کا طلسم ۔ کوفہ و بغداد ۔ اندیشۂ نظر

۴۔ شاعر کے نزدیک کلیمی کب بے کار ہوتی ہے؟

۵۔ کالم ''الف'' کا تعلق کالم ''ب'' سے ظاہر کریں اور ''ج'' میں تحریر کریں۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
آزاد	اسم مکاں	....
فکر مدرسہ	قافیہ	....
کوفہ	مرکب اضافی	....
دم	تشبیہہ/ اسم زماں	....

۶۔ غزل کے آخری دو اشعار کی تشریح کریں۔

۷۔ غزل میں استعمال کی گئیں مختلف تشبیہات کی نشاندہی کریں۔

۸۔ درج ذیل مرکبات/ تراکیب/ الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

اہلِ نظر۔ فقیہہ شہر۔ دل کی کشاد۔ رموزِ قلندری۔ رِشی کے فاقوں۔ برہمن کا طلسم۔ عصائے کلیمی۔ سوئے کوفہ۔ مئے خانہ فرنگ

صنائع بدائع اور ان کی پہچان

تعریف: لفظ صنائع صنعت کی جمع ہے اِس کے لغوی معنی ''ہنرمندی اور کاری گری'' ہیں۔ اصطلاحی مفہوم وہ عجیب و غریب نکات اور باریکیاں ہیں۔ جو عام طور پر نظم میں ظاہر کی جائیں۔ اس کے ساتھ لفظ بدائع آتا ہے۔ تو یہ لفظ بدیع کی جمع ہے۔ جس کے لغوی معنی ''نئی اور انوکھی چیز'' کے ہیں۔ اصطلاحی مفہوم علم بدائع وہ علم ہے۔ جس میں کلام کی خوبیوں پر بحث کی جائے۔ اور کلام کی خوبیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک لفظی خوبیاں اور دوسری معنوی خوبیاں ہیں۔ اور ان کو دوسرے لفظوں میں صنائع لفظی اور صنائع معنوی کہتے ہیں۔ علم بدیع کے ذریعے کلام میں رنگینی، دل آویزی، خوبصورتی اور دل کشی پیدا کی جاسکتی ہے اور اِن طریقوں کے ذریعے سے تحریر اور تقریر کو بہتر اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔

مختلف اقسام: علم صنائع و بدائع کی متعدد اقسام ہیں۔ لیکن چند ایک اقسام درج ذیل یں۔

حسنِ تعلیل ۔ صنعتِ تضاد ۔ مراۃ النظیر ۔ تلمیح ۔ صنعتِ ایہام ۔ صنعتِ ترصیع ۔ لف ونشر۔ تجنیس۔ اشتقاق۔ صنعتِ تکرار۔ مبالغہ۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ طلبہ سے کسی غیر مطبوعہ یا تکنیکی (کمپیوٹر) متن لکھوائیں۔
۲۔ کسی غیر مطبوعہ یا تکنیکی (کمپیوٹر) متن کا تجزیہ کروا کے ان سے تنقیدی رائے لیں۔
۳۔ طلبہ کو شاعرِ مشرق کی اور غزلیات بھی سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ طلبہ کو بیسویں صدی کے اوائل کے اُردو غزل میں موجود رجحانات پر لیکچر دیں۔
۲۔ اُردو غزل کی تاریخ میں شاعرِ مشرق کا مقام بتائیں۔
۳۔ شاعرِ مشرق کے اُسلوبِ غزل گوئی پر سیر حاصل بحث کریں۔

فیض احمد فیض

(حالاتِ زندگی)

فیض احمد فیض ۱۹۱۰ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قادر میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مسجد میں قرآن پاک ناظرہ سے پڑھا۔ پھر ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ مولوی سید میر حسن کے شاگرد رہے۔ مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے کیا۔ بعدازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی اور ایم اے عربی کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔

پہلے ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ مابعد ہیلی کالج لاہور میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہوگئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ٹائمز لاہور کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اِسی ادارے کے زیرِاہتمام روزنامہ ''امروز'' اور ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کا اجرا ہوا۔ تو فیض تینوں کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے اور ۱۹۵۵ء میں رہائی ملی

رہائی کے بعد پہلے الحمرا آرٹ کونسل کے سیکرٹری مقرر ہوگئے پھر اسلامیہ کالج کراچی کے پرنسپل تعینات ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد لندن چلے گئے آزادیِ فلسطین کے رسالہ ''لوٹس'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ روس نے انہیں ''لینن پرائز'' دیا۔

جدید اُردو شاعری میں فیض منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ شاعری میں ایک نئی روایت کے علم بردار ہیں۔ فیض ''ترقی پسند تحریک'' کے بانیوں میں سے تھے۔ اُنہوں نے غزل کی معروف روایت کو اپنے نصب العین کے تحت مفہوم کے ساتھ بیان کیا۔ اور مروجہ الفاظ کو نہایت فنکارانہ انداز میں نئے معنی عطا کیے۔

فیض کے انداز بیان میں ایسا تیکھا پن ہے؛ کہ جو اُس دور کے شعرا میں کم نظر آتا ہے۔ نظم میں اختصار اور بیان میں جامعیت محسوسات کو چُھو کر نکل جاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں بے حد خوبصورت تشبیہات کے علاوہ الفاظ کی خوبصورت تراکیب موجود ہیں۔ اِن تراکیب کو فیض نے نئے معانی عطا کیے ہیں۔ اُن کی شاعری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ایک قوت عمل بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ جو اُن کی شاعری کو زندگی کے قریب تر کر دیتی ہے۔

دستِ صبا، نقشِ فریادی، سرِ وادیِ سینا، دست تہِ سنگ، رات دی رات، زنداں نامہ اور شامِ شہرِ یاراں، اُن کے شعری مجموعے ہیں۔ اِن تمام کو ''نسخہ ہائے وفا'' میں یک جا کر دیا گیا ہے۔

آپ نے ۱۹۸۴ء میں لاہور میں وفات پائی۔

غزل

(فیض احمد فیض)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو بتانا کہ فیض احمد فیض کا شمار جدید اُردو غزل کے بانیوں میں ہوتا ہے۔
۲۔ اردو کی جدید غزل کی خصوصیات سے آگاہ کرنا۔
۳۔ فیض احمد فیض کے فکر اور اسلوب سے واقفیت دلانا۔
۴۔ بحروں اور اوزان سے متعارف کرانا۔
۵۔ ردیف، قافیہ، مطلع اور مقطع سے واقفیت دلانا۔

خاص الفاظ وتراکیب: وسوسے ۔ روزِ جزا ۔ خارگلو ۔ نشاطِ آہ ۔ وقارِ دست ۔ مزاجِ بادِ صبا ۔ صدق وصفا ۔ بادباں ۔ مضطرب ۔ ابرِ بہار۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِگلو بنا، جو اُٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دُعا گیا

نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا نہ روش وہ ابرِ بہار کی
جس ادا سے یار تھے آشنا، وہ مزاج بادِ صبا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ آبروئے وفا گئی
سرِعام جب ہوئے مدعی تو ثوابِ صدق وصفا گیا

ابھی بادبان کو تہہ رکھو ابھی مضطرب ہے رُخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آ کے چلا گیا

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) بقول شاعر لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا کیوں گیا؟

ب) شاعر نے ''وقارِ دستِ دُعا'' کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟

ج) غزل میں استعمال ہونے والی تراکیب کی نشان دہی کریں۔

۲۔ غزل کے اشعار کے مطابق درج ذیل میں سے دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) فصلِ بہار، قواعد کی رو سے ہے۔

i) مرکب توصیفی　ii) مرکب اضافی

iii) مرکب عطفی　iv) مرکب عددی

ب) غزل میں لفظ ''گیا'' استعمال ہوا ہے بطور

i) ردیف　ii) قافیہ

iii) تشبیہ　iv) استعارہ

ج) خدا، جزا، دُعا، صفا وغیرہ جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں بطور

i) قافیہ　ii) ردیف

iii) تلمیح　iv) صنائع و بدائع

د) غزل کے آخری شعر میں صنعت کا استعمال ہوا ہے۔

i) لف و نشر　ii) تلمیح

iii) تضاد　iv) ایہام

ہ) غزل کا پہلا شعر کہلاتا ہے۔

i) مقطع　ii) مطلع

iii) ردیف　iv) قافیہ

۳۔ غزل کے مطابق درج ذیل خالی جگہیں درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) وہ پڑی ہیں روزِ قیامتیں کہ خیالِ روزِ .... گیا۔ (سزا۔ جزا۔ وفا)

ب) وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ .... گیا۔ (دوا۔ دُعا۔ خطا)

ج) جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ آبروئے .... گئی۔ (جفا۔ وفا۔ ادا)

د) جس ادا سے .... تھا آشنا، وہ مزاجِ بادِ صبا گیا۔ (دوست۔ یار۔ محبوب)

ہ) کسی راستے میں ہے .... وہ سکوں جو آ کے چلا گیا۔ (منتظر۔ مضطرب۔ پریشان)

۴۔ کتاب میں شامل فیض احمد فیض کی غزل کا مجموعی تاثر اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۵۔ غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کریں۔

۶۔ درج ذیل مرکبات کی مختصر وضاحت کریں۔

خیالِ روزِ جزا، وقارِ دستِ دُعا، صدق وصفا، نشاطِ آہِ سحر

۷۔ غزل میں بیان کیے گئے شاعر کے خیالات سے آپ کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے ذرائع ابلاغ اور کمپیوٹر وغیرہ کے اثرات کا زبان کے حوالے سے تجزیہ کروائیں اور ان کا ذاتی نقطۂ نظر بھی متعلقہ پلیٹ فارم پر پیش کروائیں۔

۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کے ادبی مطالعہ کو روزمرہ زندگی سے ہم آہنگ کروا کر ان کے ادبی مطالعہ کو عملی زندگی کا حصہ بنوائیں۔

۳۔ کمرۂ جماعت میں فیض احمد فیض کی نسخہ ہائے وفا سے چند اور غزلیں بھی سنوائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو جدید اُردو غزل کی خصوصیات سے آگاہ کریں۔

۲۔ طلبہ کو فیض احمد فیض کے منفرد اسلوبِ غزل اور فکر پر ایک مفصل لیکچر دیں۔

۳۔ اساتذہ کرام طلبہ کو بحروں اور اُوزان کے بارے میں بتائیں۔

ناصر کاظمی

(حالاتِ زندگی)

نام ناصر رضا کاظمی اور تخلص ناصؔر تھا۔ ۱۹۲۵ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ والد محمد سلطان فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ ناصر نے ابتدائی تعلیم انبالہ میں حاصل کی۔ ہائی اسکول انبالہ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور آگئے۔ جہاں اسلامیہ کالج سے انٹر اور بی اے کا امتحان پاس کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آکر مستقل طور پر رہنے لگے۔ پہلے لاہور ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں ملازمت کرلی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر رسالہ ''اوراقِ نو'' کے عملہ ادارت میں چلے گئے۔ کچھ عرصہ محکمہ سماجی بہبود میں رابطہ آفیسر بھی رہے۔ اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر ویلج ایڈ کے طور پر بھی چند ماہ کام کیا۔ پہلے رسالہ ''ہم لوگ'' کے نائب مدیر اور مابعد ''ہمایوں'' رسالہ کے مدیر رہے۔ آخر میں ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہوگئے۔ اور ریڈیو کے ادبی پروگرام کو معیاری بنائے۔

ناصر کاظمی نے شاعری کی ابتدا سانیٹ اور نظم سے کی۔ بعد میں نظم چھوڑ کر غزل لکھنے لگے۔ غزل میں حفیظ ہوشیار پوری سے اصلاح لیتے رہے اور ان کی راہنمائی میں پرسوز غزلیں لکھیں۔ ان کی غزلوں میں غمِ عشق کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار بھی ملتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں آفاقی غم اُن کی غزل میں شیر وشکر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بلا کا سوز، درد اور کرب پایا جاتا ہے۔ جو پڑھنے والے کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک اثر انداز ہوتا ہے۔

وہ گہرے جذبات اور پیچیدہ معاملات کو آسان سے آسان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کی صحیح قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ ناصؔر کی غزل رومانیت سے بھرپور ہے۔ وہ دلی کیفیات کو غزل کے خاص مزاج کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ اُن کی غزل میں دل کی تڑپ، کسک اور چُبھن صاف محسوس ہوتی ہے۔

وہ نئی نسل کے فکری اور جذباتی رجحانات کو بڑی خوبصورتی سے غزل میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے تقسیم ملک کے حالات واثرات کو اپنی غزل کا موضوع بنایا۔ تقسیمِ ملک کے گہرے اثرات اور اس کے نتیجے میں داخلی کیفیت آپ کے پورے کلام پر چھائی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اُنہیں یقین ہے؛ کہ مستقبل میں ایسے دن ضرور آئیں گے؛ جب یہ ملک امن وسکون کا گہوارہ ہوگا۔

ناصؔر کاظمی اُردو کے منفرد غزل گو شاعر ہیں۔ جدید اُردو غزل میں وہ ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی غزل رچے ہوئے شعری مذاق کی حامل ہے۔ اُنہوں نے غزل کو حُسن، نِکھار اور تازگی عطا کی۔

آپ نے ۱۹۷۲ء میں وفات پائی۔

غزل

(ناصؔر کاظمی)

تدریسی مقاصد

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو غزل کا ارتقا بتانا۔
۲۔ طلبہ کو ناصر کاظمی کا اسلوب بتانا۔
۳۔ طلبہ کو اُردو کی جدید غزل کی خصوصیات سے آگاہ کرنا۔
۴۔ طلبہ سے عملاً تنقیدی جُملے لکھوانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: لہر ۔ خانہء دل ۔ شریکِ سخن ۔ خامشی ۔ حویلی ۔ برپا ۔ ہم سخن

دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو! ابھی سے اُٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

(دیوان ناصؔر کاظمی)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) پہلے شعر میں شاعر نے اپنے دل کی حالت زار کیوں کر بیان کی ہے؟

ب) دوسرے شعر میں ''دیوار گرنے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ج) پانچویں شعر میں شاعر نے محبوب کے کمرے کا نقشہ کیوں کر بیان کیا ہے؟

د) آخری شعر میں شاعر کس اُمید کا اظہار کرتا ہے؟

ہ) محفل میں دوستوں کے اٹھنے پر شاعر کس ردِعمل کا اظہار کرتا ہے؟

و) شاعر کا اِس دنیا میں کیوں دل نہیں لگتا؟

۲۔ غزل کے مطابق درج ذیل جملوں میں درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) دوسرے شعر میں صنعت استعمال ہوئی ہے۔

i) تلمیح
ii) لف ونشر
iii) تجنیس
iv) تضاد

ب) نصاب میں شامل غزل ناصر کاظمی کے مجموعے میں شامل ہے۔

i) پہلی بارش
ii) برگ نے
iii) دیوان ناصر کاظمی
iv) نشاط خواب

ج) اِس غزل میں لفظ ''ابھی'' استعمال ہوا ہے بطور۔

i) تلمیح
ii) قافیہ
iii) ردیف
iv) تشبیہ

د) اِس غزل میں الفاظ چلی۔ گری۔ کمی۔ خامشی۔ کھلی استعمال ہوئے ہیں بطور۔

i) ردیف
ii) قافیہ
iii) لف ونشر
iv) مجاز

مطلع اور مقطع

مطلع: غزل یا قصیدے کا وہ پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم وزن، ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوں مطلع کہلاتا ہے۔ مثلاً

ع دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

مقطع: مقطع سے مراد کسی غزل یا قصیدے کا وہ آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ اور جس کی تکمیل کے ساتھ ہی غزل یا قصیدے کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً

ع دل تو میرا اداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

(یاد رہے۔ اگر کسی غزل یا قصیدے کے آخری شعر میں شاعر نے اپنا تخلص ستعمال نہ کیا ہو تو وہ غزل کا آخری شعر ضرور کہلائے گا۔ مگر مقطع نہیں کہلائے گا)

۳۔ اِس غزل میں مطلع اور مقطع کی نشاندہی کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے تنقیدی جملے لکھوائیں۔
۲۔ طلبہ سے شاعری میں ہیئت کے لحاظ سے مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ، وزن اور بحر کی شناخت کروائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو غزل کے ارتقائی سفر سے آگاہ کریں۔
۲۔ ناصر کاظمی کے مختلف مجموعوں سے منتخب کر کے چند غزلیات سنوائیں۔
۳۔ ناصر کاظمی کے اسلوب پر لیکچر دیں۔

احمد فراز

(حالاتِ زندگی)

اُردو کے عظیم شاعر احمد فراز ۱۹۳۱ء میں کوہاٹ میں سید امیر جان کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاندانی نام سید احمد شاہ تھا، مگر ادبی نام احمد فراز سے مشہور ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول پشاور سے میٹرک کرنے کے بعد ایڈورڈز کالج پشاور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم۔اے اُردو اور ایم۔اے فارسی کے امتحان پاس کیے۔

احمد فراز مختلف سرکاری محکموں سے وابستہ رہے۔ ایم۔اے کرنے کے بعد پہلے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے؛ پھر اسلامیہ کالج پشاور میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان نیشنل سنٹر پشاور کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں وزارتِ اطلاعات سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں اکیڈمی ادبیات پاکستان کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۲۰۰۶ء تک نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ رہی ہے۔

اُن کی ادبی خدمات کے صلے میں ۱۹۸۸ء میں آدم جی ادبی ایوارڈ اور ۱۹۸۸ء میں ہی انہیں بھارت میں ''فراق گورکھپوری ایوارڈ'' جب کہ ۱۹۹۰ء میں ''اباسین ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ ان کی شاعری کے تراجم انگریزی، فرانسیسی، ہندی، یوگوسلاوی، روسی، جرمنی اور پنجابی زبان میں ہو چکے ہیں۔

احمد فرازؔ نے ادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی سے کیا۔ اسی دوران میں ریڈیو پاکستان کے لیے فیچر لکھنا شروع کیے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزلوں سے کی۔ ان کے انداز میں ایسا تیکھا پن پایا جاتا ہے جو بہت کم شعرا کے ہاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تلخ حقائق، تجربات و مشاہدات اور زمانے کی ناقدری کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ جہاں اُن کے کلام میں خوشی و مسرت کی لہر موجود ہے؛ وہاں سوز و گداز، دکھ، رنج اور غم و الم کی کیفیات بھی غالب نظر آتی ہیں۔

ان کی غزلوں میں طنز کی چاشنی بھی موجود ہے مگر ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت سادگی ہے۔ اُن کی غزلوں میں بے حد ایجاز و اختصار ہے۔ وہ طویل سے طویل مضمون کو ایسے احسن طریقے سے مختصر کر کے اشعار میں پیش کرتے ہیں کہ ان میں معجزانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں موسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ شوخی، صفائی، شیرینی اور گھلاوٹ اُن کی غزلوں میں موجود ہے۔

اُن کی وفات ۲۰۰۸ء میں ہوئی۔

غزل

(احمد فراز)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو غزل میں موجود رجحانات سے واقفیت دلانا۔
۲۔ جدید اُردو غزل میں نئی نئی تشبیہات و استعارات کے استعمال کے بارے میں بتانا۔
۳۔ جدید اُردو غزل میں احمد فراز کے مقام سے آگاہی دینا۔
۴۔ احمد فراز کے فنِ غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنا۔

خاص الفاظ و تراکیب مقدر۔ در ۔ محو ۔ دردِ ہجر ۔ ناصحانِ شہر ۔ چارہ گر ۔ ستم گر۔ جزیرۂ جاں۔ رفتہ رفتہ

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہوگئے
پھر جو بھی در ملا ہے اُسی در کے ہوگئے

پھر یوں ہُوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہوگئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہوگئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہوگئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اُسی کافر کے ہوگئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کا ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہوگئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہوگئے

(جاناں جاناں)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) غزل کے دوسرے شعر کے مطابق شاعر غیروں کو دل سے کیوں لگاتا ہے؟

ب) تیسرے شعر میں شاعر گزرے ہوئے لوگوں کو کس طرح یاد کرتا ہے؟

ج) چوتھے شعر میں شاعر کی پتھر سے کیا مراد ہے؟

د) غزل کے مطلع کے مطابق بچھڑنے کے بعد شاعر کا مقدر کیا ہوا؟

ہ) مقطع میں شاعر خود کو کس طرح تسلی دیتا ہے؟

۲۔ غزل کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) لفظ ''پتھر'' غزل میں ہے۔

i) ردیف
ii) قافیہ
iii) استعارہ
iv) تشبیہ

ب) ''یادِیار'' ہے۔

i) مرکب اضافی
ii) مرکب توصیفی
iii) مرکب اشاری
iv) مرکب عطفی

ج) ''کے ہو گئے'' بطور استعمال ہوا ہے۔

i) ردیف
ii) قافیہ
iii) تلمیح
iv) مطلع

د) دوسرے شعر میں صنعت کا استعمال ہوا ہے۔

i) ایہام
ii) لف ونشر
iii) تکرار
iv) تضاد

۳۔ غزل کے آخری دو اشعار کی تشریح کریں۔

۴۔ درج ذیل کی مختصر وضاحت کریں۔

کوئے ستم گر۔ دردِ ہجر۔ مقدر کے ہو گئے۔ جزیرۂ جاں۔ چارہ گر۔

۵۔ غزل میں شاعر نے جن جن صنعتوں کا استعمال کیا ہے ان کی نشان دہی کریں۔

۶۔ غزل میں شاعر نے مختلف تشبیہات کا استعمال کیا ہے ان کی نشاندہی کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اخبارات و رسائل کے کسی ادبی حصے پر جامع تبصرہ کروائیں۔

۲۔ طلبہ کو غزل اور نظم کے درمیان فرق سے آگاہ کروائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو غزل میں رواں رجحانات کے بارے میں لیکچر دیں۔

۲۔ احمد فراز کے اُسلوبِ شاعری سے آگاہ کریں۔

۳۔ جدید اُردو غزل میں احمد فراز کے مقام پر سیر حاصل گفتگو کریں۔

احمد ندیم قاسمی (بہ حیثیت شاعر)

(حالاتِ زندگی)

احمد ندیم قاسمی ۱۹۱۶ء میں خوشاب کے گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پیر غلام نبی بہت بڑے مبلغِ اسلام تھے۔ ندیم نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں والد کے انتقال کے بعد اپنے چچا پیر حیدر شاہ کے پاس کیمبل پور چلے گئے۔ جہاں سے عربی، فارسی اور تفسیر حقانی کی تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران شعروشاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بہاولپور کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

پہلے ریفارمر کمیشن لاہور میں ملازمت اختیار کی۔ پھر محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر تعینات ہوئے۔ مگر جلد ہی اس سے دل اُکتا گیا اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اوکاڑہ میں چند روز تک ٹیلی فون آپریٹر بھی رہے۔ ۱۹۴۲ء میں ہفت روزہ ''پھول'' اور ہفت روزہ ''تہذیبِ نسواں'' لاہور کے مدیر مقرر ہوئے اور جلد ہی ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور کے ادرات کے فرائض بھی سنبھالے۔ ۱۹۴۸ء میں روزنامہ ''امروز'' لاہور اور کراچی کے مدیر مقرر ہوئے۔

۱۹۶۷ء میں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کے لیے نظر بند کر دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں ''مجلس ترقی ادب لاہور'' کے ناظم اور ۱۹۷۶ء میں بزمِ اقبال کے اعزازی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء سے اپنے رسالہ ''فنون'' کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ''تمغہ حُسنِ کارکردگی'' اور ستارہ امتیاز سے نوازا۔ ۲۰۰۶ء میں لاہور میں وفات پائی۔

احمد ندیم قاسمی نے شاعری کا آغاز پندرہ برس کی عمر سے کیا۔ انہوں نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی غرضیکہ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق، تجربات و مشاہدات کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں؛ بڑے مخلوص و دیانت کے ساتھ کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں حیاتِ انسانی کی حقیقی ترجمانی کی ہے؛ اور اپنے کلام میں انسان کے بنیادی مصائب اور زندگی کے اٹل حقائق کی دل کش تصویر پیش کی ہے۔

احمد ندیم قاسمی زبان کے اعتبار سے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کی سادگی، مضامین کی پاکیزگی، خیالات کی بلندی، جذبات کی ترجمانی اور ترنم جیسی صفات بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ ان کے خیالات سادہ اور اسلوبِ بیان عام فہم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ ان کے کلام میں بے حد خوبصورت تشبیہات کے علاوہ الفاظ کی خوبصورت تراکیب بھی موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ایک قوتِ عمل بھی کارفرما نظر آتی ہیں جوان کی شاعری کو زندگی کے قریب تر کر دیتی ہے۔

رم جھم، جلال و جمال، شعلہ گل، دشتِ وفا، بسیط اور محیط اُن کے شعری مجموعے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں لاہور میں وفات پائی۔

غزل

(احمد ندیم قاسمی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو غزل کی تاریخ سے آگاہی دینا۔
۲۔ جدید اُردو غزل میں احمد ندیم قاسمی کے مقام سے آگاہ کرنا۔
۳۔ احمد ندیم قاسمی کے افکار و خیالات سے واقفیت دلانا۔
۴۔ احمد ندیم قاسمی کا اسلوبِ غزل بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: رسائی ۔ اکیلے پن ۔ خودنمائی ۔ اسیرِ زندگی ۔ مرحلہ۔ چرچا۔ کبریائی ۔ مبہوت ۔ شہرہ ۔ پارسائی

کوئی اِمکاں نہیں تجھ تک رسائی کا
ادا حق ہوگیا تیری جدائی کا

ہمیشہ کے اکیلے پن سے گھبرا کر
کوئی دعویٰ نہیں کرتا خدائی کا

مجھے تو حُسن نے مبہوت کر ڈالا
غلط شہرہ ہے میری پارسائی کا

اندھیرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے
کہ شب کو بھی تو حق ہے خودنمائی کا

اسیرِ زندگی کا وقتِ آخر ہے
اب اگلا مرحلہ ہوگا رہائی کا

میں ٹھوکر کھا کے گِرتا ہوں تو یاد آئے
بہت چرچا ہے جس کی کبریائی کا

(بسیط)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) پہلے شعر کے مطابق جدائی کا حق شاعر کس طرح ادا کرتا ہے؟

ب) تیسرے شعر کے مطابق شاعر کی پارسائی کا غلط شہرہ کیوں ہے؟

ج) اسیرِ زندگی سے شاعر کی کیا مُراد ہے؟

د) جب شاعر ٹھوکر کھاتا ہے تو اُسے کون یاد آتا ہے اور کیوں؟

ہ) شاعر اپنی پارسائی کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟

۲۔ غزل کے متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ''خودنمائی'' بطور استعمال ہوا ہے۔

i) قافیہ ii) ردیف

iii) تلمیح iv) لف و نشر

ب) لفظ ''کا'' بطور استعمال ہوا ہے۔

i) قافیہ ii) صنعت

iii) استعارہ iv) ردیف

ج) نصاب میں شامل غزل احمد ندیم قاسمی کے مجموعے سے لی گئی ہے۔

i) بسیط ii) شعلۂ گُل

iii) محیط iv) ارض و سما

۳۔ غزل کے مطابق درج ذیل میں درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) احمد ندیم قاسمی ایک کلاسیکل شاعر ہے۔

ب) غزل کے پہلے شعر میں عموماً ردیف اور قافیہ دونوں ہوتے ہیں۔

ج) شاعر تنہائی سے نہیں گھبراتا۔

د) شاعر مقطع میں اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

ہ) ''اسیرِ زندگی'' کا اگلا مرحلہ موت ہوتا ہے۔

۴۔ غزل کے پہلے دو اشعار کی تشریح کریں۔

۵۔ غزل میں موجود مختلف تشبیہات و استعارات کی نشاندہی کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے عصرِ حاضر کے معاشی اور سیاسی مسائل پر اپنا نقطہ نظر تحریر کروائیں۔
۲۔ طلبہ کو صنائع بدائع پر لیکچر دیں۔
۳۔ احمد ندیم قاسمی کی چند دیگر غزلیات سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو غزل کی تاریخ سے آگاہ کریں۔
۲۔ جدید اُردو غزل میں احمد ندیم قاسمی کا مقام بتائیں۔
۳۔ احمد ندیم قاسمی کی غزل گوئی کے اسلوب پر سیر حاصل لیکچر دیں۔

شہزاد احمد

(حالاتِ زندگی)

شہزاد احمد ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر حافظ محمد بشیر کے ہاں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم۔اے نفسیات اور ایم۔اے فلسفہ کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد زیادہ تر مارکیٹنگ اور ایڈمنسٹریشن کی طرف توجہ دی اور تھل ڈیولپمنٹ اتھارٹی اور روئی کارپوریشن میں خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عرصہ ٹی وی اور فلم کے لیے بھی کام کیا۔

''حلقہ اربابِ ذوق'' کے رکن اور سیکرٹری جنرل بھی رہے ان کی بہترین ادبی خدمات کے صلے میں ۱۹۶۹ء میں آدم جی ادبی ایوارڈ، ۱۹۹۲ء میں نقوش ایوارڈ، ۱۹۹۴ء میں علامہ اقبال ادبی ایوارڈ اور حکومت پاکستان کی جانب سے تمغہ حسن کارکردگی کا ایوارڈ دیا گیا۔

ہماری غزل کا بنیادی موضوع ہی محبت اور اس سے وابستہ احساسات و جذبات کا فنکارانہ اظہار رہا ہے مگر شہزاد احمد اُردو کا پہلا غزل گو ہے جس نے غزل کے اس بنیادی موضوع کو تجربے کے علاوہ علم کی سطح پر بھی برتا ہے اور یوں وہ محبت کی نفسیات کا ماہر غزل گو تسلیم کیا گیا ہے۔

شہزاد احمد کی غزل میں شاعرانہ مہارت، مضامین کا تنوع، بلند خیالی، زورِ بیان اور الفاظ و تراکیب کا عمدہ استعمال ملتا ہے۔ الفاظ و تراکیب میں خاص حُسن، کلام میں ترنم اور تسلسل کی مخصوص فضا پڑھنے والے کو مسحور کر دیتی ہے۔ اُن کی غزل میں موسیقی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اُن کی غزل میں دل کو بھانے والی جملہ کیفیات موجود ہیں۔

نثر میں اُن کے مضامین اور ڈرامے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ زبان بڑی سلیس اور سادہ استعمال کرتے ہیں جس میں روزمرہ اور محاورہ کا بہت استعمال ہوتا ہے۔ وہ عبارت کو خوبصورت اور ادبی بنانے کے لیے تشبیہات بھی استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے متعدد ڈراموں اور مضامین کے تراجم بھی کیے ہیں۔ یہ تراجم اس قدر شُستہ زبان میں ہیں کہ ان پر طبع زاد ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔

شاعری میں ان کی تصانیف صدف، جلتی بجھتی آنکھیں، بکھر جانے کی رُت، ٹوٹا پل اور رنگِ غزل زیادہ مقبول ہیں جب کہ نثر میں مذہب تہذیب موت، ذہین انسانی حدود وامکانات، سائنس کے عظیم مضامین جب کہ تراجم میں اسلامی فلسفے کی تاریخ، اسلام کی پہچان، اسلامی آرٹ اور مسلم فلسفے کی تاریخ قابلِ ذکر ہیں۔

اُنہوں نے ۲۰۱۲ء میں لاہور میں وفات پائی۔

غزل

(شہزادؔ احمد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو غزل میں جدّت سے آگاہ کرنا۔ ۲۔ شہزادؔ کے اسلوبِ غزل سے آگاہی دینا۔
۳۔ جدید اُردو غزل میں شہزاد احمد کا مقام بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: جبیں ۔ بَل پڑنا ۔ کسک ۔ مردہ محبتیں ۔ رُت ۔ خلل پڑے ۔ طبع ۔ شعلہ سا ۔ پانی اُبلنا ۔ ماہتاب

یہ سوچ کر کہ تیری جبیں پر نہ بَل پڑے
بس دور ہی سے دیکھ لیا اور چل پڑے
دل میں پھر اِک کسک سی اُٹھی مدّتوں کے بعد
اِک عمر کے رُکے ہوئے آنسو نکل پڑے
سینے میں بے قرار ہیں مُردہ محبتیں
ممکن ہے یہ چراغ کبھی خود ہی جَل پڑے
اے دل تجھے بدلتی ہوئی رُت سے کیا ملا
پودوں میں پھول اور درختوں میں پھل پڑے
اب کس کے انتظار میں جاگیں تمام شب
وہ ساتھ ہو تو نیند میں کیسے خلل پڑے
سورج سی اُس کی طبع ہے، شعلہ سا اُس کا رنگ
چھُو جائے اُس بدن کو تو پانی اُبل پڑے
شہزادؔ دل کو ضبط کا یارا نہیں رہا
نکلا جو ماہتاب، سمندر اُچھل پڑے

(بکھر جانے کی رُت سے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) پہلے شعر کے مطابق شاعر اپنے محبوب کو دُور سے کیوں دیکھتا ہے؟

ب) مدّتوں کے بعد شاعر کے ساتھ کیا واقعہ رونما ہوتا ہے؟

ج) چوتھے شعر میں شاعر دل سے کس طرح مخاطب ہے؟

د) پانچویں شعر میں شاعر کو سکون کی نیند کیوں آ رہی ہے؟

ہ) مقطع میں شاعر کا ''ماہتاب'' سے کیا مراد ہے؟

۲۔ غزل کے متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نصاب میں شامل غزل شہزاد احمد کے مجموعے میں شامل ہے۔

i) صدف
ii) جلتی بجھتی آنکھیں
iii) ٹوٹل پُل
iv) بکھر جانے کی رُت

ب) نصاب میں شامل شہزاد احمد کا کلام صنف سخن کے لحاظ سے ہے۔

i) نظم
ii) غزل
iii) مثنوی
iv) رباعی

ج) غزل میں لفظ ''پڑے'' استعمال ہوا ہے بطور۔

i) قافیہ
ii) ردیف
iii) مقطع
iv) مطلع

د) غزل میں بل ۔ چل ۔ نکل ۔ جل ۔ پھل ۔ خلل ۔ اُبل ۔ اُچھل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں بطور۔

i) ردیف
ii) قافیہ
iii) تشبیہ
iv) استعارہ

۳۔ درج ذیل میں درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) شہزاد احمد کا شمار جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔

ب) اُردو ادب میں غزل قدیم روایت کی امین ہے۔

ج) غزل نظم کے مقابلے میں ایک جدید صنفِ سخن ہے۔

د) ایک غزل میں صرف ایک ہی خیال کا اظہار ہو سکتا ہے۔

ہ) غزل کے تمام اشعار کا ایک دوسرے سے تعلق ہوتا ہے۔

۴۔ غزل کے دوسرے اور تیسرے شعر کی تشریح کریں۔

۵۔ غزل کے مطلع میں شاعر نے جس جذبے کا اظہار کیا، آپ اس سے کس قدر اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں، اور کیوں؟

۶۔ غزل کے آخری دو اشعار کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

۷۔ شہزاد احمد کی نصاب میں شامل غزل کے تناظر میں اُردو ادب میں جدید غزل میں موجود رجحانات پر بحث کریں۔

۸۔ ''جبیں پر بل پڑے'' شاعر نے کس تناظر میں استعمال کیا ہے؟

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کوئی بھی ادبی فن پارہ اس طرح پڑھوائیں۔ کہ وہ خود بھی ادب تخلیق کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

۲۔ طلبہ سے روزمرہ زندگی کے مختلف نوعیت کے فارم پُر کروائیں۔

۳۔ روزمرہ زندگی میں ضرورت کی رسیدات لکھوائیں۔

اساتذہ کے لیے

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اردو غزل میں جدّت اور اس کے رجحانات پر لیکچر دیں۔

۲۔ جدید اُردو غزل میں شہزاد احمد کے مقام پر لیکچر دیں۔

ظفر اقبال

(حالاتِ زندگی)

ظفر اقبال ۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کو پاکستان کے شہر اوکاڑہ میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ مختلف اخبارات میں مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ ظفر اقبال موجودہ عہد میں اُردو غزل کا ایسا درخشاں ستارہ ہیں جس کے بغیر اس عہد کی پہچان ممکن نہیں۔ اُردو غزل کے منظر نامے پر ظفر اقبال کے ظہور کو تخلیقی آتش فشاں کے پھٹ پڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس کی شرر افشانی بعد میں بھی جاری رہی۔ جب چنگاریاں اُڑ رہی ہوں تو تنقید کا دامن جھلس بھی سکتا ہے۔ ظفر اقبال کے معاملے میں کچھ ایسا ہی ہوا۔

غزل کی روایت اُردو میں فارسی کے بہت بعد کی ہے لیکن اس کا آسمان کیسے کیسے چاند ستاروں سے سجا ہوا ہے۔ گرانچی کا کہنا ہے کہ کسی بھی تخلیق کو اپنی جگہ بنانے کے لیے یا کسی بھی نئی تخلیقی آواز کو اپنی گنجائش پیدا کرنے کے لیے ایک پورے سلسلے کو بے دخل کرنا پڑتا ہے۔ اُنہیں حکومت پاکستان کی جانب ہلالِ امتیاز اور تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔

ظفر اقبال کے بے پناہ زورِ بیان اور خوش کلامی نے کچھ ایسا ہی کارنامہ سرانجام دیا کہ ان سے بیگانے تو ناخوش تھے ہی، اپنے بھی کچھ زیادہ خوش نہیں۔ اگر ماضی میں وہ لسانی تشکیلات کے رطب و یابس کو جھیل گئے ہیں تو معاصرانہ سنسناہٹوں کا خار وخش بھی ان کے آڑے آنے والا نہیں۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''آبِ رواں'' کے نام سے چھپا تھا۔ بعد میں ''گلِ آفتاب، اب تک اور غبار آلود سمتوں کا سراغ'' وغیرہ چھپے۔ انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربات کیے۔ عام طور پر انہوں نے اپنی شاعری میں دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ کا استعمال کیے۔ خصوصاً ''گل آفتاب'' میں انہوں نے عُروج اور روایتی انداز سے ہٹ کر لسانی تجربات کیے۔ وہ لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

غزل

(ظفر اقبال)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو ظفر اقبال کی شاعری سے واقفیت دلانا
۲۔ ظفر اقبال کی غزل میں انفرادیت تلاش کرنا۔
۳۔ جدید اُردو غزل میں ظفر اقبال کا مقام بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: خوابِ خاک ۔ نیام ۔ زاویے ۔ لرزنا ۔ فلک بہ فلک ۔ ہوسِ خام ۔ آبِ رواں ۔ در و بام

بکھری ہوئی فلک بہ فلک شام ہے کوئی
آنکھوں میں شعلہ ہوسِ خام ہے کوئی

ہلتے ہیں زاویے تو لرزتا ہوں میں بھی ساتھ
آبِ رواں پہ عکسِ در و بام ہے کوئی

اتنے ہجوم میں کسے ڈستا ہے دیکھیے
سبزے پہ سرسراتا ہوا نام ہے کوئی

تلوار ایسے اُس کے بدن میں اُتار دی
جیسے کہ آدمی نہیں وہ نیام ہے کوئی

اس طرح خوابِ خاک میں اُلجھا ہوں اے ظفرؔ
گویا زمین ذرّہ نہیں دام ہے کوئی

(گلافتاب)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر شعلہ ہوسِ خام سے کیا مُراد لیتے ہیں؟

ب) تیسرے شعر میں شاعر کیا بتانا چاہتا ہے؟

ج) شاعر خوابِ خاک میں کیوں اُلجھا ہے؟

د) زاویوں کے لرزنے سے شاعر کس طرح لرزتا ہے؟

ہ) غزل میں استعمال ہونے والی تراکیب کی نشان دہی کریں۔

۲۔ غزل کے اشعار کے مطابق دُرست جواب کی نشان دہی کریں۔

الف) چوتھے شعر میں شاعر نے استعمال کیا ہے۔

i) تلمیح ii) استعارہ iii) تشبیہ iv) تشبیہ واستعارہ دونوں

ب) نصاب میں شامل ظفر اقبال کی غزل اُس کی کتاب میں شامل ہے۔

i) تفاوت ii) عیب و ہنر iii) گل آفتاب iv) نسخہ ہائے وفا

ج) غزل میں لفظ ''کوئی'' استعمال ہوا ہے بطور

i) ردیف ii) استعارہ iii) قافیہ iv) تشبیہ

د) شام، خام، بام وغیرہ جیسے الفاظ غزل میں استعمال ہوئے ہیں بطور:

i) ردیف ii) قافیہ iii) مطلع iv) مقطع

ہ) ''خوابِ خاک'' قواعد کی رُو سے ہے۔

i) مرکب اضافی ii) مرکب توصیفی iii) مرکب عددی iv) مرکب عطفی

۳۔ غزل کے اشعار کے مطابق درج ذیل خالی جگہیں درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) اتنے ہجوم میں کسے .... ہے دیکھیے (ڈستا ۔ کاٹتا ۔ پٹتا)

ب) تلوار ایسے اُس کے بدن میں............ دی۔ (اتار ۔ مار ۔گھونپ)

ج) اس طرح خواب............ میں اُلجھا ہوں اے ظفر (خاک ۔ خرگوش ۔ عیش)

(د) آنکھوں میں شعلہ ہوں .... ہے کوئی (بام ۔ خام ۔ نام)

(د) جلتے ہیں .... تو لرزتا ہوں میں بھی ساتھ (زاویے ۔ فاصلے ۔ ہونٹ)

۴۔ غزل کے مطابق درج ذیل اشعار مکمل کریں۔

الف) .... عکسِ در و بام ہے کوئی

آبِ رواں پہ ....

ب) .... نام ہے کوئی

سبزے پہ سرسراتا ہوا ....

ج) .... وہ نیام ہے کوئی

جیسے کہ آدمی نہیں ....

د) .... دام ہے کوئی

گویا زمین ذرہ نہیں ....

د) بکھری ہوئی فلک پہ فلک شام ہے کوئی

....

۵۔ غزل کے آخری تین اشعار کی تشریح کریں۔

۶۔ درج ذیل کی مختصر وضاحت کریں۔

نیام ۔ خوابِ خاک ۔ آبِ رواں ۔ عکسِ در و بام

۷۔ غزل میں بیان کیے گئے شاعر کے خیالات سے آپ کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی مشاعرے کی روداد تحریر کروائیں۔

۲۔ کمرۂ جماعت میں ظفر اقبال کی چند اور غزلیں سنوائی جائیں۔

اشارات سبق

۱۔ طلبہ کو ظفر اقبال کی شاعری سے متعارف کروائیں۔

۲۔ ظفر اقبال کی غزل میں انفرادیت بتائیں۔

۳۔ جدید اُردو غزل میں ظفر اقبال کے مقام سے آگاہ کریں۔

شکیب جلالی

(حالاتِ زندگی)

شکیب جلالی کا اصل نام سید حسن رضوی، یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء کو علی گڑھ کے ایک قصبے سیدانہ جلال میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زیادہ عرصہ بدایوں میں گزارا۔ جہاں اُن کے والد ملازمت کے سلسلے میں تعینات تھے۔ لیکن دس سال کی عمر میں والدہ کی حادثاتی موت کے بعد اُن کے والد ذہنی توازن کھو بیٹھے اور پھر کچھ دنوں بعد انتقال کر گئے۔ اِن دونوں واقعات کا سید حسن رضوی کے ذہن پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ وہ شکیب جلالی بن گئے۔

۱۹۵۰ء میں شکیب جلالی نے بدایوں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر پاکستان چلے آئے جہاں سیالکوٹ سے انہوں نے ایف۔اے اور پھر لاہور سے بی۔اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ ایم۔اے کرنے کے آرزومند تھے مگر معاشی تنگ دستی آڑے آئی۔ راولپنڈی سے ایک ادبی جریدے ''گونج'' کا اجرا کیا مگر بدقسمتی سے یہ جریدہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکا اور لاہور واپس آئے۔

لاہور میں انہوں نے چند ادبی جرائد کے لیے کام کیا۔ جن میں ''شاہکار''، ''وحدت'' اور ''جاوید'' شامل ہیں۔ اس کے بعد وہ صحافتی میدان میں آگئے اور روزنامہ ''مغربی پاکستان اور مشرق'' کے لیے کام کیا۔ پھر بھکر میں تھل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی میں ملازمت اختیار کی۔

اُن کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو نیا لہجہ دیا۔ وہ منفرد اسلوب کے شاعر تھے۔ ان کی غزل کا مزاج سب سے مختلف ہے۔ جہاں بھی شعری طرز احساس اور جدید طرز احساس کے خوبصورت ترین امتزاج کی بات ہوتی ہے تو شکیب جلالی کا نام سرفہرست دکھائی دیتا ہے۔

شکیب جلالی کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے جو پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ وہ بات کو نہایت آسان، سادہ اور عام فہم الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی غموں سے بھری ہوئی تھی۔ جس کا اثر ان کے کلام پر پڑنا یقینی تھا۔ لہٰذا ان کے کلام میں جس قدر سوز و گداز موجود ہے شاید ہی میر تقی میر کے علاوہ کسی اور شاعر کے ہاں موجود ہو۔ اُن کی شاعری غم والم اور مصائب کا مجموعہ ہے۔

اُن کی غزلیات کا مجموعہ ''روشنی اے روشنی'' اُن کی وفات کے چھ سال بعد ۱۹۷۲ء میں شایع ہوا۔ اس مجموعہ کلام کا شمار اُردو کے چند اہم ترین شعری مجموعوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں صرف ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

غزل

(شکیب جلالی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو غزل میں بہ تدریج بدلتے ہوئے رجحانات کی شاندہی کرنا۔
۲۔ شکیب جلالی کے خوبصورت استعارات اور تشبیہات سے آشنا کرانا۔
۳۔ اُردو غزل میں شکیب جلالی کا مقام بتانا۔
۴۔ عبارت کو خاص رفتار کے ساتھ منتخب انداز (Skim & Scan) میں سکھانا۔

خاص الفاظ و تراکیب پیڑ۔ وحشت۔ آنکھ جھپکی ۔ پتوار ۔ دلدل ۔ پرستار ۔ آئینہ بردار ۔ تجلّی۔ دستار ۔ پسِ دیوار

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے، پسِ دیوار گرے

ایسی وحشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں، ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

دیکھ کر اپنے در و بام لرز جاتا ہوں
میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکتی ہوئی تلوار گرے

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

وہ تجلّی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہوئے تیر
آئینے ٹوٹ گئے، آئینہ بردار گرے

دیکھتے کیوں ہو شکیب اتنی بلندی کی طرف
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر پہلے شعر میں کیا بتانا چاہتا ہے۔

ب) شاعر کے ہاتھ سے پتوار کیوں گرے؟

ج) شاعر کیوں اپنے ہی قدموں میں گرنا چاہتا ہے؟

د) سر پر لٹکتی ہوئی تلوار سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

ہ) غزل میں استعمال کی گئی مختلف تشبیہات اور استعارات کی نشاندہی کریں۔

۲۔ غزل کے مطابق درج ذیل میں درست کی نشاندہی کریں۔

الف) دوسرے شعر میں شاعر نے استعمال کیا ہے:

(i) محاورہ (ii) استعارہ (iii) تشبیہ (iv) تلمیح

ب) تیسرے شعر میں شاعر اظہار کرتا ہے:

(i) غرور کا (ii) خودداری کا (iii) عاجزی کا (iv) بے وفائی کا

ج) چوتھے شعر میں شاعر نے ذکر کیا ہے:

(i) موت کا (ii) زندگی کا (iii) مایوسی کا (iv) گھبراہٹ کا

د) آنکھ جھپکنا، قواعد کی رو سے ہے:

(i) تلمیح (ii) تشبیہ (iii) استعارہ (iv) کنایہ

۳۔ غزل کے مطابق درج ذیل خالی جگہیں درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) ایسی .... تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی (دہشت / وحشت)

ب) آ کے پتھر تو مرے .... میں دو چار گرے (صحن / گھر)

ج) آنکھ جھپکی بھی نہیں ہاتھ سے .... گرے (تلوار / پتوار)

د) ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی .... کے سوا (دلدل / سراب)

ہ) نہ اٹھایا کرو .... کو کہ یہ دستار گرے (سر / گردن)

۴۔ غزل کے مطابق درج ذیل اشعار مکمل کریں۔

الف) ایسی وحشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی

....

ب) وقت کی ڈور خدا جانے کہاں ٹوٹے

....

ج) ....

ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

د) ....

آئینے ٹوٹ گئے آئینہ بردار گرے

ہ) دیکھتے کیوں ہو شکیب اتنی بلندی کی طرف

....

۵۔ درج ذیل کی مختصر وضاحت کریں۔

آئینہ بردار گرے۔ سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ۔ خوابوں کے پرستار ۔ تجلّی کی شعاعیں

۶۔ غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کریں۔

۷۔ کتاب میں شامل شکیب جلالی کی غزل کے مجموعی تاثر سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی ادب پارے کے بارے میں تنقیدی رائے لیں اور اس کی حسن و قبح کا اندازہ لگوائیں۔
۲۔ کسی بھی عبارت کو خاص رفتار کے ساتھ منتخب انداز میں (Skim & Scan) کر کے پڑھوائیں۔
۳۔ شکیب جلالی کے مجموعہ کلام ''روشنی اے روشنی'' سے چند غزلیات اور سنوائی جائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو میں بدلتے رجحانات کی نشاندہی مثالوں کے ذریعے کروائیں۔
۲۔ شکیب جلالی کی شاعری میں استعمال کیے گئے استعارات اور تشبیہات سے آگاہ کریں۔
۳۔ اُردو غزل گوئی میں شکیب جلالی کا مقام بتائیں۔

"حصہ نظم"

فاطمہ بنتِ عبداللہ

(علامہ محمد اقبال)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو ادب میں نظم کی روایت سے آگاہ کرنا۔
۲۔ ادب پارے کے مرکزی خیال سے روشناس کرانا۔
۳۔ نظم "فاطمہ بنتِ عبداللہ" کے فنی محاسن بتانا۔
۴۔ اُردو شاعری میں شاعرِ مشرق کی نظم گوئی کی اہمیت بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: سعادت ۔ حورِ صحرائی ۔ جسارت آفریں ۔ تیغ و سپر ۔ امتِ مرحوم ۔ شبنم افشاں
نالۂ ماتم ۔ نغمۂ عشرت ۔ نشاط انگیز ۔ تربت خاموش

فاطمہ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی تیری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سِپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اُس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تُربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نُور

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بحرِ نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

(بانگِ درا)

مشق

درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) ''اُمت مرحوم'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
ب) چوتھے شعر میں شاعر کی ''کلی'' سے کیا مراد ہے؟
ج) دورانِ جہاد ''فاطمہ'' نے کون سا کردار ادا کیا؟
د) آٹھویں شعر میں شاعر کی ''قومِ تازہ'' سے کیا مراد ہے؟
ہ) شاعر کا ''گلستانِ خزاں منظر'' سے کیا مراد ہے؟
و) فاطمہ نے اللہ کی راہ میں بے تیغ و سپر کیونکر جہاد کیا؟
ز) اِس نظم میں شاعر کی فضائے آسماں میں اُبھرنے والے ستاروں سے کیا مراد ہے؟
ح) پانچویں شعر میں شاعر نے ''آہو'' کا لفظ کس کے لیے استعمال کیا ہے؟
ط) اقبال نے یہ نظم کس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' ایک نظم ہے۔

i) فطری ii) تاثراتی

iii) تجریدی iv) حقیقت نگاری

ب) ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' صنف سخن کے لحاظ سے ہے۔

i) مثنوی ii) غزل

iii) نظم iv) رباعی

ج) ''بنتِ عبداللہ'' قواعد کی رو سے ہے۔

i) خطاب ii) لقب

iii) کنیت iv) عُرف

د) نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' شاعر مشرق کے مجموعے میں شامل ہے۔

i) بانگ درا ii) بال جبریل

iii) ضرب کلیم iv) پیام مشرق

ڈ) علامہ اقبال اُردو زبان کے علاوہ شاعری کرتے تھے۔

i) فارسی زبان میں ii) انگریزی زبان میں

iii) پشتو زبان میں iv) پنجابی زبان میں

۳۔ ذیل میں سے درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) نظم ایک جدید صنف سخن ہے۔

ب) اُردو ادب میں نظم کی ابتدا دکن سے ہوئی۔

ج) نظم کے ہر شعر میں ردیف و قافیہ کی پابندی ضروری ہے۔

د) اُردو ادب میں غزل سے پہلے نظم کی ابتدا ہو چکی تھی۔

ہ) فاطمہ اس جنگ میں شہید ہو گئیں۔

۴۔ نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' میں شاعر نے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کا ذکر کیا ہے۔ اس کی مختصر وضاحت کریں۔

۵۔ درج ذیل کی وضاحت کریں۔

دیدۂ انسان سے نامحرم۔ تربتِ خاموش۔ رقص تری خاک کا۔ شبنم افشاں آنکھ۔ آہو۔ حورِ صحرائی۔ آبروئے اُمت مرحوم۔ سقائی۔ اندازِ کہن۔ نالۂ ماتم۔

۶۔ نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے اس نظم کا مرکزی خیال اور بنیادی نکات لکھوائیں۔

۲۔ طلبہ کو شاعرِ مشرق کے مختلف شعری مجموعے دکھائیں۔ اور اُن میں سے مختلف نظمیں کمرہ جماعت میں سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو اُردو ادب میں نظم کی روایت سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو شاعری میں شاعرِ مشرق کی نظم گوئی کی اہمیت بتائیں۔

۳۔ نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' کے فنی محاسن بتائیں۔

او دیس سے آنے والے بتا!

(اختر شیرانی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو شاعری میں رومانیت کے تصور سے آگاہ کرنا۔
۲۔ اُردو ادب میں نظم کی مقبولیت کی وجوہات بتانا۔
۳۔ اختر شیرانی کے اسلوبِ سخن کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت دلانا۔
۴۔ رومانوی تحریک کے حوالے سے اختر شیرانی کا مقام بتانا۔
۵۔ اختر شیرانی کی نظم میں استعمال ہونے والے مختلف تشبیہات و استعارات کی وضاحت کرنا۔

خاص الفاظ و تراکیب: آوارۂ غربت ۔ گھنگھور گھٹائیں ۔ برکھائیں ۔ یارانِ وطن ۔ سرمست نظارے ۔ کِنعانِ وطن ۔ سہانی راتیں ۔ احباب ۔ مہتاب

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہے یاران وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا کس رنگ میں ہے کِنعان وطن
وہ باغ وطن، فردوس وطن، وہ سرو وطن، ریحان وطن

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں

او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں

اختر شیرانی

(حالاتِ زندگی)

آپ کا نام محمد داؤد خان اور اختر تخلص تھا۔ ۱۹۰۵ء کو ریاست ٹونک حافظ محمود خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ افغانوں کے مشہور و ممتاز قبیلے شیرانی سے نسبت کی وجہ سے آپ کو شیرانی کہا جاتا تھا۔ اور اختر شیرانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں حاصل کی۔ ان کے والد اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر تعینات تھے۔ اُنھوں نے لاہور بلالیا۔ جہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مگر لاہور کے ماحول اور طبیعت کی رنگینی کے باعث تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔

چند ماہ رسالہ ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر رہے؛ پھر ''انتخاب'' کی ادارت کی۔ ۱۹۲۸ء میں اپنا رسالہ ''خیالستان'' نکالا۔ جو زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اس کے بعد ''رومان'' کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا مگر اس کا حشر بھی ''خیالستان'' جیسا ہوا۔ اس کے بعد علامہ تاجور کے رسالہ ''شاہکار'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دینا شروع کیے۔ مگر جلد ہی اُس سے الگ ہو گئے۔

اختر شیرانی رومانی شاعر تھے۔ اُن کی شاعری کی روح تغزل ہے۔ اسی روح کو وہ اپنی غزلوں اور گیتوں میں پھیلاتے ہیں۔ اور اپنا ایک انفرادی رنگ قائم کرتے ہیں۔ ولولہ انگیزی، رنگینی اور نزاکت اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ترنم اور موسیقیت کلامِ اختر کا نمایاں وصف ہے۔ وہ موسیقی کے سُر تال سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ردیف، قافیے اور بحریں موسیقی کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ بعض اوقات تکرارِ الفاظ سے موسیقی پیدا کرتے ہیں۔

اختر شیرانی کی تشبیہات بڑی نادر ہوتی ہیں۔ جو اُن کے کلام کے حُسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ اُن کی نظم ''تیتری'' تشبیہات کی جدّت کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اختر ایک پختہ کار شاعر تھے۔ اُن کی فنی پختگی کا ثبوت ان کی خوبصورت تصویر کاری، جذبات و احساسات کی بلیغ پیشکش سے ملتا ہے۔ اُن کے الفاظ و تراکیب بڑے جاندار اور پُر کشش ہوتے ہیں۔

وہ فارسی تراکیب بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ تراکیب نئی اور اچھوتی ہوتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں فطرت پرستی کا رجحان بھی بہت نمایاں ہے۔ وہ فطرت اور اس کے مظاہر سے بہت متاثر ہیں۔ فطرت کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان کا دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں۔ اور وہ لب کشا ہو جاتے ہیں۔

آپ نے ۱۹۴۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔

ب) ''او دیس سے آنے والے بتا!'' ایک نظم ہے۔

i) مزاحیہ ii) رومانوی iii) طنزیہ iv) اخلاقی

ج) اختر شیرانی کا شمار شعرا میں ہوتا ہے۔

i) ترقی پسند ii) رومانوی iii) کلاسک iv) پہلا اور دوسرا دونوں

د) نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' ہیت کے اعتبار سے ایک نظم ہے۔

i) آزاد ii) معریٰ iii) پابند iv) نثری

۳۔ اختر شیرانی کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کے پہلے بند میں یارانِ وطن، کنعانِ وطن، ریحانِ وطن، استعارے استعمال ہوئے ہیں۔ ان استعاروں میں ارکان استعارہ واضح کیجیے۔

۴۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کے مطابق درج ذیل خالی جگہیں دُرست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی .... نظارے ہوتے ہیں (سرمست۔ زبردست)

ب) کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب .... دریا پر (سیر۔ کنارِ)

ج) کیا اب بھی کسی کے .... میں باقی ہے ہماری چاہ بتا (سینے۔ دل)

د) او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہے .... وطن (یارانِ۔ اہل)

ہ) کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی .... کو بھاتی ہیں (نظروں۔ دلوں)

۵۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' میں شاعر نے جس طرح کی منظر کشی کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۷۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کے آخری دو بند کی تشریح کریں۔

۸۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کو پڑھنے کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا اور کیوں؟

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی فن پارے میں علم بیان یعنی تشبیہ استعارے، مجاز مرسل، کنایہ وغیرہ کی شناخت کروائیں۔

۲۔ کسی ادب پارے کے بارے میں انتقادی رائے لیں اور اس کے حسن و قبح کا اندازہ اور درجہ بندی کروائیں۔

۳۔ کمرۂ جماعت میں اختر شیرانی کی چند اور نظمیں بھی سنوائی جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو اُردو ادب میں رومانوی تحریک پر لیکچر دیں۔

۲۔ اُردو ادب میں نظم کی مقبولیت کی وجوہات سے آگاہ کریں۔

۳۔ رومانوی شاعری میں اختر شیرانی کا مقام بتائیں۔

۴۔ اختر شیرانی کے اُسلوب سے واقفیت دلائیں۔

جوشؔ ملیح آبادی

(حالاتِ زندگی)

جوش ملیح آبادی لکھنؤ کے نواحی علاقے ملیح آباد میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ پورا نام شبیر حسن خان اور جوشؔ تخلص تھا۔ قلمی نام جوش ملیح آبادی اختیار کیا۔ آباؤاجداد کا تعلق کابل (افغانستان) سے تھا۔ ملیح آباد آپ کی خاندانی جگہ تھی۔ جوش کے دادا اور والد دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ فارسی اور اُردو کی کتابیں گھر پر رہ کر پڑھیں۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سینٹ پیٹرز کالج آگرہ اور پھر علی گڑھ چلے گئے مگر لاابالی پن کی وجہ سے تعلیم کی تکمیل نہ کرسکے۔ اس لیے سینئر کیمبرج سے آگے نہ بڑھ سکے۔

والد کے انتقال پر آبائی جائیداد کے انتظام میں مصروف ہوگئے۔ پھر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں بہ حیثیت ناظرِ ادبی ملازم ہوگئے۔ نظامِ دکن کے خلاف نظم لکھنے پر معتوب ہوئے۔ اور ملازمت چھوڑ کر دہلی چلے آگئے۔ اور اپنا ایک ادبی رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ کچھ عرصہ بعد ملیح آباد چلے گئے۔ پھر شالیمار فلم کمپنی سے وابستہ ہوکر پونا چلے گئے اور پانچ سال وہاں قیام کیا۔ آزادی کے بعد حکومت ہند کے شعبہ نشریات میں اردو کے نگران اعلیٰ مقرر ہوئے۔ حکومت ہند نے ''پدم بھوشن'' کا اعزاز دیا۔ ۱۹۵۷ء میں کراچی آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ اور ترقیِ اردو بورڈ کی جانب سے اردو لغت کے نگران مقرر ہوئے۔

جوشؔ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے ابتدا میں غزلیں لکھیں۔ مگر جلد ہی نظم کی طرف متوجہ ہوئے اُردو کی مقبول ترین صنفِ سخن غزل سے اُن کی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ ان کا شمار غزل کے مخالفین میں ہوتا ہے۔ وہ نظم کے شاعر تھے۔ اور شاعرِ انقلاب کہلائے۔ اُن کی شہرت کا زیادہ انحصار نظم پر ہے۔ اُن کی نظم نگاری کی نمایاں خصوصیات میں لفظوں کا برمحل استعمال، تراکیب کی بندش اور عمدہ منظر کشی ہے۔ وہ زبان و بیان پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ رومانوی اور سیاسی شاعری ان کا امتیاز ہے۔

جوش بڑے بسیار گو تھے۔ اُن کے شعری مجموعوں کی تعداد سترہ سے زیادہ ہے۔ جن میں ''روحِ ادب، شعلہ و شبنم۔ سموم و صبا، سرود و خروش، عرش و فرش، رامش و رنگ، الہام و افکار اور نجوم و جواہر'' زیادہ مشہور ہیں۔ ''محراب و مضراب'' ان کی وفات کے بعد شایع ہوئی۔

جوشؔ مرثیے اور رباعی کے بھی باکمال شاعر تھے۔ آپ پاکستان اور بھارت کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھے۔ نثر میں ''یادوں کی برات'' بڑی معروف ہے جو ان کی آپ بیتی ہے۔

آپ نے ۱۹۸۲ء میں اسلام آباد میں وفات پائی۔

وَحدتِ انسانی

(جوش ملیح آبادی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو جدید اردو نظم سے آشنا کرنا۔
۲۔ اردو ادب میں جدید نظم کی اہمیت بتانا۔
۳۔ جوش ملیح آبادی کے اسلوبِ سخن سے آگاہ کرنا۔
۴۔ جدید اُردو نظم میں جوش کا مقام بتانا۔
۵۔ اتحاد واتفاق کا درس دینا۔
۶۔ نصابی کتب کے علاوہ دیگر علمی کتب کے مطالعہ کا شوق اُجاگر کرنا

خاص الفاظ و تراکیب: کدورت ۔ رغبت ۔ وحشت ۔ پائمال ۔ رحمتِ عمیم ۔ نزول ۔ خوبانِ بوستان
شمول۔ عِلّت ۔ تیر گی فشاں

اے دوست دل میں گردِ کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا، بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون، پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغزار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

ہوتے ہیں پائمال تو کہتے ہیں زرد پھول
کل رحمتِ عمیم کا، ہم پر بھی تھا نزول
خوبانِ بوستان میں ہمارا بھی تھا شمول
اے راہرو، نہ ڈال ہمارے سروں پہ دھول
ہر چند انجمن کے نکالے ہوئے ہیں ہم
لیکن صبا کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

بے جان و جاندار کی بنیاد ایک ہے
ارض و سما کی علّتِ ایجاد ایک ہے
بُت سینکڑوں ہیں حُسنِ خداداد ایک ہے
سب دل الگ الگ ہیں مگر یاد ایک ہے
یکساں ہے مال، گو ہیں دکانیں جدا جدا
معنی ہیں سب کے ایک زبانیں جدا جدا

جو روشنی پھکاں ہے سو ہے وہ بھی آدمی   جو تیرگی فشاں ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
جو یار مہرباں ہے، سو ہے وہ بھی آدمی   اور جو عدوئے جاں ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تو بھاگ خواہ موت سے، یا زندگی سے بھاگ
اے آدمی کبھی نہ مگر آدمی سے بھاگ

(شعلہ و شبنم)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) پہلے شعر میں شاعر کس بات کی تلقین کرتا ہے؟

ب) شاعر کے مطابق کانٹے کی رگ میں کیا موجود ہے؟

ج) ''ہر چند انجمن کے نکالے ہوئے ہیں ہم'' سے شاعر کیا مراد لیتے ہیں؟

د) بقول شاعر بے جان و جاندار کی بنیاد کیوں ایک ہے؟

ہ) نظم کے آخری شعر میں شاعر آدمی کو کس بات کی تاکید کرتا ہے؟

و) ارض و سماء کی علتِ ایجاد کیوں کر ایک ہو سکتی ہے؟

۲۔ نظم ''وحدتِ انسانی'' کے مطابق درست جواب کی نشاندہی کریں۔

الف) نظم وحدتِ انسانی، کا شاعر ہے۔

i) اختر شیرانی   ii) میراجی

iii) ن۔م۔راشد   iv) جوش ملیح آبادی

ب) نظم کے پہلے شعر میں صنعت کا استعمال ہوا ہے۔

i) تضاد   ii) تلمیح

iii) لف و نشر   iv) استعارہ

ج) وحدت انسانی، صنف سخن کے لحاظ سے ہے۔

i) نثری نظم ii) آزاد نظم

iii) معریٰ نظم iv) پابند نظم

د) نظم کے تیسرے بند کے پہلے دو اشعار کی ردیف ہے۔

i) بنیاد ii) خداداد

iii) ایک ہے iv) ایجاد

ہ) نظم ''وحدتِ انسانی'' جوش ملیح آبادی کی کتاب سے لی گئی ہے۔

i) روح ادب ii) شعلہ و شبنم

iii) سرود و خروش iv) بسیط

۳۔ نظم ''وحدت انسانی'' کے مطابق خالی جگہ مناسب الفاظ سے پُر کریں۔

الف) پہلے بند کی ردیف .... ہے۔

ب) دوسرے بند کے آخری شعر میں ''نکالے ہوئے ہیں'' بطور .... استعمال ہوئے ہیں۔

ج) نظم کے آخری شعر میں صنعت .... کا استعمال ہوا ہے۔

د) ''حُسنِ خداداد'' سے شاعر کی مراد .... ہے۔

ہ) ''نسیم بہار'' کا شاعر نے بطور .... استعمال کیا ہے۔

۴۔ نظم ''وحدتِ انسانی'' کے مطابق درج ذیل اشعار مکمل کریں۔

الف) جو روشنی چکاں ہے سو ہے وہ بھی آدمی

....

ب) ....

....

ارض وسما کی علت ایجاد ایک ہے

ج) یکساں ہے مال، گو ہیں دکانیں جُدا جُدا

....

د) کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو مرغزار کا

....

ہ) بت سینکڑوں ہیں حُسن خداداد ایک ہے

....

۵۔ نظم ''وحدتِ انسانی'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔ نظم ''وحدت انسانی'' کے آخری بند کی تشریح کریں۔

۷۔ نظم ''وحدت انسانی'' سے آپ کو کیا سبق ملا؟ مختصراً اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۸۔ نظم ''وحدت انسانی'' میں بیان کیے گئے شاعر کے خیالات سے آپ کس حد تک اتفاق یا اختلاف رکھتے ہیں اور کیوں؟

سرگرمیاں

۱۔ یہاں! اساتذہ کرام طلبہ کو طویل کلام سنا کر اُس کے اہم نکات، جملے، مصرعے یا اشعار یکجا کروائیں تا کہ بعد میں یہی تحریر و تقریر میں استعمال کیے جا سکیں۔

۲۔ اساتذہ کرام طلبہ کو احساس، جذبے اور تاثر کے حوالے سے مجازی زبان سُنا کر اس کے حسن و قبح کا اندازہ استحسانی، تنقیدی نگاہ سے کروائیں۔

۳۔ کمرۂ جماعت میں جوش ملیح آبادی کی چند اور نظمیں سنائیں۔

۴۔ طلبہ کو نصابی کتب کے علاوہ دیگر علمی کتب کے مطالعے کے لیے لائبریری جانے کی ترغیب دیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ نظم ''وحدت انسانی'' کی روشنی میں طلبہ کو اتحاد و اتفاق کا درس دیں۔

۲۔ جدید اُردو نظم گوئی سے آگاہ کریں۔

۳۔ جوش ملیح آبادی کے اُسلوبِ سخن سے آگاہ کریں۔

۴۔ جدید اُردو نظم کی تاریخ میں جوش ملیح آبادی کا مقام بتائیں۔

میراجی

(حالاتِ زندگی)

میراجی کا اصل نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا۔ مگر وہ اپنے ادبی نام اور تخلص میراجی سے ہی ادبی حلقوں میں متعارف و مشہور ہوئے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد منشی مہتاب الدین ریلوے انجینئر تھے اور اس ملازمت کی بہ دولت اُنہیں اکثر مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ لہٰذا اِسی وجہ سے میراجی کی تعلیم و تربیت بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوئی۔

سات سال کی عمر میں قصبہ ماحول (گجرات کاٹھیاواڑ) کے سکول میں داخل کیے گئے مگر جلد ہی انہیں بوستان (بلوچستان) اور سکھر جانا پڑا۔ اور پھر لاہور جا کر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انٹر میں داخلہ لیا مگر تعلیم مکمل نہ کر سکے۔

دورانِ طالب علمی کتب بینی کا شوق جاری رہا۔ مولانا صلاح الدین نے اُن کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انہیں نائب مدیر بنا لیا۔ چار سال تک میراجی ادبی دنیا سے منسلک رہے۔ اور یہ چار سال ادبی دنیا میں فنی فروغ کے چار بہترین سال تھے مابعد ادبی دنیا سے قطع تعلق کر کے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہوئے، ریڈیو کے مسودات لکھنے میں اُنہوں نے کافی مہارت حاصل کر لی، اور حسبِ ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔ گیت بھی اُنہوں نے ریڈیو ہی میں جا کر لکھے۔ اور اتنے گیت لکھے کہ اُن کا مجموعہ ''گیت ہی گیت'' کے نام سے شائع ہوا۔

چند سال دہلی میں گزارنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے۔ جہاں کچھ دنوں ایک ادبی رسالہ ''خیال'' نکالا۔

میراجی علم عروض سے بہ خوبی واقف اور جملہ اصنافِ شعر پر حاوی ہیں۔ بالخصوص اُن کی غزلیں ستھری اور گیت نہایت مترنم اور میٹھے ہیں۔ وہ حسن کا شعور بہ خوبی رکھتے ہیں۔ گیتوں کے ساتھ ساتھ میراجی جس صنف میں روایت کے بہت قریب رہے ہیں وہ غزل ہے۔ اُن کی سبھی غزلیں کلاسیکی روایتی ہیت میں ہیں۔ اور ان میں میؔر کی سی سادگی ہے۔

آزاد نظم کے علاوہ دیگر اصناف میں میراجی کا اسلوب بڑی حد تک روایتی اور دل کش ہے۔ اُنہوں نے صحیح زبان استعمال کی ہے۔ چوں کہ وہ ہندی زبان کی سرشت سے بہ خوبی واقف تھے اس لیے اُنہیں ہندی کے نہایت موزوں بلکہ رسیلے الفاظ کے استعمال پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ جو اُن کی غزلوں بالخصوص گیتوں میں ترنم و نغمگی اور سوز و گداز جیسی خوش آئند خوبیوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ میراجی کا انتقال ۱۹۴۹ء میں بمبئی کے ایک ہسپتال میں ہوا۔

دُکھ کی کروٹ

(میراجی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو میراجی، کی شاعری سے متعارف کروانا۔
۲۔ میراجی کا شاعرانہ اُسلوب بتانا۔
۳۔ اُردو نظمیہ شاعری میں میراجی کے مقام سے آگاہ کرنا۔
۴۔ طلبہ میں شعرفہمی اور تشریح کی صلاحیت پیدا کرنا۔

خاص الفاظ و تراکیب: سپنے ۔ درشن ۔ گیسو کی سیاہی ۔ آکاش ۔ رُجھانے ۔ ڈالی ڈالی ۔ بھانپ گئی ۔ مورت
دھرتی ۔ پریم

آج ہوئے سپنے میں درشن، آج تو میری تباہی ہے
چاند کا نور بھی آج نگاہوں میں گیسو کی سیاہی ہے

بھیگی رات میں آنکھ کھلی ہے، کیسا چپ کا جادو ہے
لو، آکاش پہ تارا ٹوٹا، تارا ہے یا آنسو ہے؟

مَیں ہوں، اور نہیں ہے کوئی، کوئی نہیں! تنہائی ہے
رات دُلہن بن کر پھر کس کے دِل کو رُجھانے آئی ہے

نیند کی گود میں کھویا ہوا تھا، کس نے مجھے بے چین کیا؟
کِس نے مجھے بے چین کیا؟ ٹھہرو، یہ کِس کا نام لیا

رات میں نام کی گونج سُنی، تو ڈالی ڈالی کانپ گئی
اور ہوا بھی میرے دل کی بے چینی کو بھانپ گئی

سوئی لہریں جاگ کے اُٹھیں اِک طوفان کی صورت میں
کالے کالے بادل کھوئے اُجلے چاند کی مورت میں

چاند نے رُوپ چُھپایا اندھیرا جُھوم کے آیا دھرتی پر
نورانی آکاش سیاہی لے کر چھایا دھرتی پر
دھرتی کچھ بھی نہ بولی میرے دِل کی صورت ڈول گئی
اپنی مجبوری سے پریم کے بھید مجھ پر کھول گئی
پریم کا بھید کُھلا تو بادل چھٹ کے دُور ہوئے، بھاگے
چاند نے اپنا رُوپ دِکھایا ننھے تارے بھی جاگے
چاند کا نور بھی اب تو مگر مجھ کو گیسو کی سیاہی ہے
آج ہوئے سپنے میں درشن، آج تو میری تباہی ہے

(کلیاتِ میرا جی)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) نظم ''دُکھ کی کروٹ'' میں شاعر بے چین کیوں نظر آتا ہے؟

ب) شاعر پر پریم کا بھید کیوں کر کھلا؟

ج) نظم میں استعمال کیے گئے تشبیہات اور استعارات کی نشاندہی کریں؟

د) شاعر کا گیسو کی سیاہی، سے کیا مراد ہے؟

۲۔ نظم ''دُکھ کی کروٹ'' کے حوالے سے دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نظم ''دُکھ کی کروٹ'' کے دوسرے شعر میں شاعر استعمال کرتا ہے۔

i) کنایہ ii) استعارہ
iii) تشبیہ iv) تلمیح

ب) نظم ''دُکھ کی کروٹ'' ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

i) رُباعی کی ii) مثنوی کی
iii) مخمس کی iv) مسدس کی

ج) نظم ''دُکھ کی کروٹ'' رجحان کے لحاظ سے ایک نظم ہے۔

i) مزاحیہ ii) طنزیہ

iii) رومانوی iv) اخلاقی

د) نظم ''دُکھ کی کروٹ'' میں شاعر ذکر کرتا ہے۔

i) اپنی قسمت کا ii) اپنی پریشانی کا

iii) اپنی ناکامی کا iv) اپنے خواب کا

ہ) ''دُکھ کی کروٹ'' ایک نظم ہے۔

i) نثری ii) آزاد

iii) معریٰ iv) پابند

۳۔ نظم ''دُکھ کی کروٹ'' کے مطابق دُرست الفاظ سے خالی جگہ پُر کریں۔

الف) نیند کی گود میں کھویا ہوا تھا کس نے مجھے .... کیا؟ (بے چین، پریشان، بے غم)

ب) رات میں نام کی گونج سُنی تو ڈالی ڈالی.......... گئی (جاگ، کانپ، بھانپ)

ج) نورانی آکاش سیاہی لے کر چھایا.......... پر (زمین، دھرتی، آسمان)

د) اپنی مجبوری سے پریم کے بھید مجھ پر .... گئی (کھول، افشاں، چھپا)

ہ) سوئی لہریں جاگ کے اُٹھیں اک .... کی صورت میں (طوفان، سیلاب، دریا)

۴۔ نظم ''دُکھ کی کروٹ'' کے مطابق درج ذیل اشعار مکمل کریں۔

الف) میں ہوں اور نہیں ہے کوئی، کوئی نہیں انتہائی ہے

....

ب) ....

....

اور ہوا بھی میرے دل کی بے چینی کو بھانپ گئی

ج) چاند نے رُوپ چھپایا اندھیرا جھوم کے آیا دھرتی پر

....

ر)   پریم کا بھید کُھلا تو بادل چھٹ کے دُور ہوئے، بھاگے

....

ڑ)   ....

آج ہوئے سپنے میں درشن، آج تو میری تباہی ہے

۵۔   نظم ''دُکھ کی کروٹ'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔   نظم میں شاعر اپنے بارے میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے اُنہیں اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۷۔   نظم میں شاعر نے جس طرح کی منظر کشی کی ہے اُسے مختصر بیان کریں۔

۸۔   نظم کے آخری چھ اشعار کی تشریح کریں۔

سرگرمیاں

۱۔   اساتذۂ کرام طلبہ سے شعری و ادبی مضمون، انداز بیان میں تراکیب کو سمجھ کر اور مرکبات کو عملاً استعمال کروائیں۔

۲۔   بنیادی اسالیب بیان کروائیں۔

۳۔   کمرۂ جماعت میں میرا جی کی چند نظمیں سنوائی جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔   طلبہ کو میرا جی کی شاعری سے متعارف کروائیں۔

۲۔   میرا جی کا اسلوب بتائیں۔

۳۔   طلبہ کو شعر فہمی اور تشریح کرنے کا طریقہ بتائیں۔

۴۔   اُردو نظم نگاری میں میرا جی کے مقام سے آگاہ کریں۔

مجید امجد

(حالاتِ زندگی)

مجید امجد ۱۹۱۴ء میں گجرات میں پیدا ہوئے۔ اصل نام عبدالمجید چوہان تھا۔ عمر کا زیادہ حصہ لاہور میں گزارا۔ ابتدائی تعلیم گجرات ہی میں حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی اے کا امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کیا۔

آغاز دنوں میں لاہور کے چند اخبارات اور رسائل میں کام کیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے اور وہاں سے پندرہ روزہ مزاحیہ رسالہ ''نمکدان'' نکالا؛ جو بہت مقبول ہوا۔ اس دوران میں اُردو ادبیات میں ترقی پسند تحریک اور جدید ادب کی تحریک دونوں راہ پا چکی تھیں۔ مگر ان کا طرۂ امتیاز یہ تھا۔ کہ وہ ان تحریکات کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی کسی تحریک سے براہِ راست اور عملی طور پر وابستہ نہ ہوئے۔ ہفتہ وار اخبار ''عروج'' جھنگ کے مدیر رہے۔

مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اس لیے ہر شام بلاناغہ بزم فکروادب کی لائبریری میں جاتے تھے۔ رسائل اور کتب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مختلف اُردو اور فارسی لُغات کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ لفظوں کی ساخت اور معانی پر غور کرتے اور کوشش کرتے تھے؛ کہ نئے نئے الفاظ شاعری میں استعمال کیے جائیں اور اُن لفظوں کو نئے معانی عطا کیے جائیں۔

مجید امجد نے غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ اُن کی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ نظمیں بہت زیادہ ہیں۔ اُنہوں نے نظم کے میدان میں کئی نئے تجربے کیے ہیں۔ اُنہوں نے نظم میں تمام کلاسیکی ہیئتوں کو استعمال کیا ہے۔ مگر ان میں جدید تقاضوں کے مطابق اہم تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ اُنہوں نے آزاد نظموں کے علاوہ پابند نظمیں بھی لکھی ہیں۔

اُن کی نظموں میں موسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ اُن کے کلام میں موضوعات کا تنوع، لب ولہجہ کا کھرداپن، نئی تراکیب اور بحریں پہلی نظر میں اجنبی سی لگتی ہیں؛ مگر آہستہ آہستہ مطالعہ کے بعد سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ مجید امجد کی شاعری کا یہی کمال ہے؛ کہ اُن کا اپنا علیحدہ رنگ، منفرد لب ولہجہ اور الگ قدریں ہیں۔ جو پڑھنے والے کے دل پر جادوئی اثر کرتی ہیں۔

اُن کی نظموں میں اپنے زمانے کا تہذیبی عذاب، تاریخ کے خوابیدہ اوراق، دل کش مناظر، جبر وتشدد، خوف کے مختلف روپ، فنا، بے ثباتی، غربت، بھوک، استحصال اور ظلم وستم کے مضامین ملتے ہیں۔ اس لیے اُن کے ہاں انسانی کرب، دُکھ اور درد شدید کیفیت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں ساہیوال میں وفات پائی۔

طلوعِ فرض

(مجید امجد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو نظم کے مختلف پہلو اور انداز بتانا۔
۲۔ اُردو نظم گوئی میں مجید امجد کے منفرد اُسلوبِ سخن سے متعارف کروانا۔
۳۔ اُردو نظم گوئی میں مجید امجد کا مقام بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: خاموش پنچھی ۔ جال بُننا ۔ فضائے زندگی ۔ بچشمِ تر ۔ شورانگیز ۔ فراٹے بھرنا
افتادگی ۔ متاعِ زیست ۔ نشیلا ۔ کڑوا کسیلا

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں   رواں ہوں ہمراہِ صد کارواں ہوں
کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں

اُمیدوں کے سنہرے جال بُن کے   اُڑا جاتا ہے چگنے دانے دُنکے
فضائے زندگی کی آندھیوں سے

ہے ہر اِک کو بچشمِ تر گزرنا   مجھے چل کر اُسے اُڑ کر گزرنا
وہ اِک اندھی بھکارن لڑکھڑاتی

کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے   صدا سے راہگیروں کو جکڑ لے
یہ پھیلا پھیلا میلا میلا دامن

یہ کاسہ یہ گلوئے شورانگیز   میرا دفتر، میری مسلیں، میرا میز
چمکتی کار فراٹے سے گزری

غبارِ رہ نے لی کروٹ تو جاگا   اُٹھا اِک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل

یہی پرواز بھی افتادگی بھی متاعِ زیست اِس کی بھی، میری بھی
گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس شرابوں سا نشیلا کہیں گھونٹ اِک کڑوا اور کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا اِک رینگتے کیڑے کو پینا مگر مقصد وہی دو سانس جینا
سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمراہ صد کارواں ہوں

(کلیاتِ مجید امجد)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) صبح کے وقت شاعر کس جانب رواں ہے؟

ب) اندھی بھکارن چوراہے پر کس مقصد کے لیے کھڑی ہے؟

ج) خاموش پنچھی دل میں اُمیدوں کے کونسے سنہرے جال بُن رہا ہے؟

د) چمکتی کار گزرنے کے بعد اپنے پیچھے کیا چھوڑتی ہے؟

ہ) گلستان میں بھونرا کیا چوستا ہے اور کیوں؟

و) جوہڑ کے اندر سے رینگتا کیڑا کیا حاصل کرنا چاہتا ہے؟

ز) بقول شاعر گلوں کے رس کا ذائقہ کیسا ہے؟

۲۔ نظم ''طلوعِ فرض'' کے مطابق درج ذیل میں سے دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) شاعر ''صبح سویرے'' جاتا ہے۔

i) بازار ii) دفتر

iii) مسجد iv) سیر کے لیے

ب) چوراہے کے کھمبے کو پکڑ رکھا ہے۔

i) بھکاری نے ii) بھکارن نے

iii) فقیر نے iv) پاگل نے

ج) نظم ''طلوعِ فرض'' فکر کے لحاظ سے ایک نظم ہے۔

i) علامتی ii) تجریدی

iii) طنزیہ iv) مزاحیہ

د) نظم ''طلوعِ فرض'' ہیت کے لحاظ سے ایک نظم ہے۔

i) نثری ii) آزاد

iii) پابند iv) معریٰ

ہ) شاعر کے ہمراہ صبح سویرے رواں ہے۔

i) صد کارواں ii) سینکڑوں

iii) بے تحاشا لوگ iv) بے شمار بچے

۳۔ نظم ''طلوعِ فرض'' کے مطابق دُرست الفاظ سے خالی جگہیں پُر کریں۔

الف) فضائے زندگی کی .... سے (آندھیوں ۔ طوفانوں)

ب) وہ ایک .... بھکارن لڑکھڑاتی (اندھی ۔ غریب)

ج) سحر کے وقت .... کو رواں ہوں (دفتر ۔ بازار)

د) ہے ہر اِک کو بچشم .... گزرنا (نم ۔ تر)

ہ) کوئی خاموش .... اپنے دل میں (پنچھی ۔ چڑیا)

۴۔ نظم ''طلوعِ فرض'' کے مطابق درج ذیل اشعار کو مکمل کریں۔

الف) کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے ....

....

ب) سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں

....

ج) ....

اُٹھا اِک دو قدم تک ساتھ بھاگا

د) یہی پرواز بھی اُفتادگی بھی

....

ہ) پڑا اِک رینگتے کیڑے کو پینا

....

۵۔ اس نظم کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔ اس نظم میں شاعر کیا بیان کرنا چاہتا ہے اور کیوں؟

۷۔ اس نظم میں بیان کیے گئے خیالات سے آپ کس حد تک اتفاق یا اختلاف رکھتے ہیں اور کیوں؟

۸۔ اس نظم کا خلاصہ بیان کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے روزمرہ زندگی میں زبان کو ابلاغ کے لیے استعمال کروائیں۔ تاکہ وہ ادبی مطالعے کو روزمرہ زندگی سے ہم آہنگ کرواسکیں۔
۲۔ کمرۂ جماعت میں مجید امجد کے کلیات سے چند اور نظمیں سنوائی جائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو مجید امجد کے منفرد اسلوب پر تفصیلی لیکچر دیں۔ ۲۔ اُردو نظم گوئی میں مجید امجد کا مقام بتائیں۔
۳۔ مجید امجد کے کلام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کریں۔

ن۔م۔راشد

(حالات زندگی)

ن۔م۔راشد ۱۹۱۰ء میں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ نذر محمد نام تھا۔ ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اکنامکس کیا۔ کچھ عرصہ ماہنامہ ''شاہکار'' لاہور کی ادارت کی۔ پھر کمشنر ملتان کے دفتر میں ملازم ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کا تلخ ترین دور تھا اُن کی نظم ''شاعر درماندہ'' اُسی دور کی یادگار ہے۔

کچھ عرصہ بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوگئے، قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان پشاور میں کام کرتے رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں فوج کے محکمہ نشرواشاعت میں ملازمت کرلی۔ اور کیپٹن کے عہدے پر فائز ہوکر قاہرہ، تہران اور سری لنکا میں مقیم رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ریڈیو امریکہ نے اُردو پروگراموں کی نشرواشاعت کے سلسلے میں اُن کی خدمات حاصل کرلیں۔ اور انتقال تک ریڈیو امریکہ کے ساتھ منسلک رہے۔

ن۔م۔راشد جدید اُردو شعرا میں سرِفہرست ہیں۔ جنہوں نے قدیم روایات سے بغاوت کی۔ اردو نظم کو قافیہ اور ردیف کی جکڑ بندیوں سے آزاد کیا۔ اور اِسے ایک نیا اسلوب اور نئی ہیئت دی۔ اُنہوں نے اظہار کے لیے نہ صرف نئے اسالیب وضع کیے۔ بلکہ عام الفاظ کو نئے معانی دیے۔ یوں تو بے قافیہ نظمیں عبدالحلیم شرر اور اسماعیل میرٹھی نے بھی کہی ہیں؛ مگر راشد کی نظم ''آزاد'' اپنے اسلوب، فکروبیان اور اپنے مخصوص آہنگ وتاثیر کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی آزاد نظموں میں کوئی مسلمہ وزن بھی نہیں پایا جاتا۔

اُنہوں نے تشبیہات واستعارات میں بھی جدّت برتی۔ پرانی تشبیہات واستعارات اور الفاظ کو نئے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا؛ کہ اُن کی نظمیں اکثر پڑھنے والوں کے لیے مبہم ہوجاتی ہیں۔ اُن کی شاعری میں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اِن دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

اُن کی نظموں میں ایک خاص ایجاز اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ جو عہد حاضر کے بہت کم شعرا کو نصیب ہے۔ وہ اِس دور کے سب سے منفرد شاعر ہیں۔

راشد کی نظموں کے مجموعے ماورا، ایران میں اجنبی اور ''لاانسان'' ان کی زندگی میں شایع ہوچکے تھے۔ جب کہ ایک کتاب ''گمان کا ممکن'' ان کی وفات کے بعد شایع ہوئی۔ آپ نے ۱۹۷۵ء میں نیویارک میں وفات پائی۔

پہلی کرن

(ن ۔م ۔راشد)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو ن ۔م ۔راشد کی شاعری سے آگاہ کرنا۔
۲۔ اُردو نظم گوئی میں ن ۔م ۔راشد کا منفرد اسلوب بتانا۔
۳۔ جدید اُردو نظم گوئی میں ن ۔م ۔راشد کے مقام سے آگاہ کرنا۔
۴۔ اُردو منظوم ادب میں جدید نظم کی اہمیت بتانا۔

خاص الفاظ وتراکیب: زمان و مکاں ۔ اُستواری ۔ نانِ شبینہ ۔ اُمیدِ فردا ۔ زِشت ۔ جوئے شیر پائندگی ۔ آسودہ کوشی ۔ شہنائیاں ۔ دریچہ

کوئی مجھ کو دورِ زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دو!
کوئی یہ سُجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستیِ رائیگاں سے؟
کہ غیروں کی تہذیب کی اُستواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی!
میں اُس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے
نانِ شبینہ نہیں ہے
اور اس پر بھی یہ قوم دل شاد ہے شوکتِ پاستاں سے
اور اب بھی ہے اُمیدِ فردا کسی ساحرِ بے نشاں سے
مری جاں، شب و روز کی اس مشقت سے تنگ آ گیا ہوں
میں اس زِشت کوبی سے اُکتا گیا ہوں
کہاں ہیں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنہوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا
تری چھاتیوں کا جوئے شیر کیوں زہر کا اک سمندر نہ بن جائے
جسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جاں
جو اک چھپکلی بن کے چمٹی ہوئی ہے ترے سینۂ مہرباں سے

جو واقف نہیں تیرے دردِ نہاں سے
اسے بھی تو ذلت کی پائندگی کے لیے آلۂ کار بننا پڑے گا
بہت ہے کہ ہم اپنے آبا کی آسودہ کوشی کی پاداش میں آج بے دست و پا ہیں
اس آئندہ نسلوں کی زنجیرِ پا کو تو ہم توڑ ڈالیں!
مگر اے مری تیرہ راتوں کی ساتھی!
یہ شہنائیاں سن رہی ہو؟
یہ انسان کی برتری کے لیے اک نئے دور کے شادیانے ہیں سن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتوِ اولیں بھی
اُٹھو اور ہم بھی زمانہ کی تازہ ولادت کے اُس جشن میں مل کے دھومیں مچائیں
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں!

(ماورا)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) نظم ''پہلی کرن'' میں شاعر کس خواہش کا اظہار کرتا ہے؟

ب) شاعر خود کو کس قوم کا فرد سمجھتا ہے اور کیوں؟

ج) ''اُمید فردا'' سے کیا مُراد ہے؟

د) شاعر کس چیز سے اُکتاہٹ کا اظہار کرتا ہے اور کیوں؟

ہ) شاعر کے مطابق ہم بے دست و پا کیوں ہیں؟

۲۔ نظم ''پہلی کرن'' کے مطابق درج ذیل میں سے درست کا انتخاب کریں۔

الف) ''پہلی کرن'' صنفِ سخن کے لحاظ سے ہے۔

i) غزل	ii) رُباعی
iii) نظم	iv) مثنوی

ب) ''پہلی کرن'' ہیت کے لحاظ سے ایک نظم ہے۔

i) آزاد نظم ii) نثری نظم

iii) معریٰ نظم iv) پابند نظم

ج) نظم ''پہلی کرن'' تخلیق ہے۔

i) میرا جی کی ii) ڈاکٹر وزیر آغا کی

iii) منیر نیازی کی iv) ن۔م۔راشد

د) ''پہلی کرن'' فکر کے لحاظ سے ایک نظم ہے۔

i) مزاحیہ و طنزیہ ii) علامتی

iii) تجریدی iv) رومانوی

ہ) نظم ''پہلی کرن'' کا بنیادی نکتہ ہے۔

i) زندگی ii) مستقبل

iii) مساوات iv) ناانصافی

۳۔ نظم ''پہلی کرن'' کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) نظم میں ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار ہوا ہے۔

ب) نظم ایک روشن مستقبل کی نوید سُنا رہی ہے۔

ج) نظم کا مقصد درسِ انسانیت ہے۔

د) نظم میں شاعر طبقاتی فرق کا رونا روتا ہے۔

ہ) نظم کا انداز طنزیہ و مزاحیہ ہے۔

۴۔ نظم ''پہلی کرن'' کے مطابق خالی جگہیں دُرست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) کوئی مجھ کو دُورِ زمان و مکاں سے نکلنے کی .... بتادو! (صورت۔راستہ۔ذریعہ)

ب) مری جان، شب و روز کی اس .... سے تنگ آگیا ہوں (مشقت۔محنت۔ہزیمت)

ج) جو واقف نہیں تیرے .... نہاں سے (دُکھ۔درد۔مصیبت)

ز) یہی ہے نئے دور کا.................. اولیں بھی (نظارہ۔ پرتو ۔ روشنی)

د) شعاعوں کے.................. میں بے محابا نہائیں (طوفان ۔ ہواؤں ۔ جھکڑ)

۵۔ نظم ''پہلی کرن'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔ نظم میں شاعر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے آپ کس حد تک اس سے اتفاق یا اختلاف رکھتے ہیں اور کیوں؟

۷۔ نظم کے آخری پانچ اشعار کی تشریح کریں۔

۸۔ نظم کا خلاصہ قلم بند کیجیے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی ادبی یا علمی تحریر میں فنی و فکری تجزیہ کروا کر ان سے رائے لیں اور متعلقہ صنف میں اس کے مقام کا تعین کروائیں۔

۲۔ شاعری میں ہیت کے لحاظ سے مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف، وزن سادہ بحر کی شناخت کروائیں۔

۳۔ کمرۂ جماعت میں ن۔م۔راشد کی چند اور نظمیں سنوائی جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ کو ن۔م۔راشد کے منفرد اسلوب سے متعارف کروائیں۔

۲۔ جدید اُردو نظم میں ن۔م۔راشد کے مقام پر لیکچر دیں۔

۳۔ نظم گوئی میں ن۔م۔راشد کی اہمیت کے بارے میں بتائیں۔

منیر نیازی

(حالاتِ زندگی)

منیر نیازی ۱۹۲۷ء میں ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ساہیوال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بہاولپور کالج سے ایف۔ اے اور دیال سنگھ کالج لاہور سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان بحریہ میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن جلد ہی ملازمت چھوڑ کر گھر واپس آ گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے اور حصولِ معاش کے لیے مختلف کام کیے۔ ہفتہ وار رسالہ ''سات رنگ'' کا اجراء ساہیوال سے کیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سینٹر سے منسلک رہے۔ اسی دوران میں ٹیلی ویژن کے لیے کئی اُردو پنجابی نغمے لکھے۔ اس کے علاوہ ٹیلی ویژن کے متعدد پروگراموں میں حصہ لیتے رہے۔

منیر نیازی شاعری میں منفرد سوچ اور اسلوب کے مالک تھے۔ اسی لیے ان کا کلام بیش تر شعرا سے الگ تھلگ اور منفرد ہے۔ ان کی شاعری کا یہی کمال ہے کہ ان کا اپنا علیحدہ رنگ، منفرد لب و لہجہ اور الگ معنوی قدریں ہیں جو پڑھنے والے کے دل پر جادوئی اثر کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں دیہات کے ماحول، دل کش مناظر اور دیہاتیوں کے رہن سہن کا طور طریقہ بڑے خوبصورت اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں جبر و تشدد، خوف کے مختلف روپ، بے ثباتی غربت، استحصال اور ظلم و ستم کے مضامین ملتے ہیں۔

ان کے کلام میں مضامین کی پاکیزگی، خیالات کی بلندی، جذبات کی ترجمانی، جیسی صفات بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ اُردو کلام میں بعض جگہ پنجابی الفاظ کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور یہ الفاظ بوجھل محسوس نہیں ہوتے۔ ان کے اشعار میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔

ان کے کلام میں تشبیہات و استعارات کا موزوں استعمال ملتا ہے۔ ان کی تشبیہات عام فہم اور آسان ہوتی ہیں اور ان کے مطالب کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں موسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ موسیقیت پیدا کرنے کے لیے مترنم بحریں، گاتی بجاتی ردیفیں اور قافیے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں دل کو بھانے والی جملہ کیفیات موجود ہیں۔

منیر نیازی کے اُردو اور پنجابی کے مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں اس بے وفا کا شہر، تیز ہوا اور تنہا پھول، جنگل میں دھنک، روشنیوں کے درمیان شام، ماہِ منیر، چھ رنگ دروازے، سفر دی رات، چار چپ چیزاں، رستہ دسن والے تارے اور کلیاتِ منیر (سات کتابوں کا مجموعہ)۔ آپ نے ۲۰۰۹ء میں لاہور میں وفات پائی۔

زندگی

(منیر نیازی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو منیر نیازی کی نظمیہ شاعری سے متعارف کروانا۔ ۲۔ اُردو نظم گوئی میں منیر نیازی کا مقام بتانا۔
۳۔ منیر نیازی کے اسلوبِ سخن سے روشناس کروانا۔

خاص الفاظ وتراکیب دھاریوں ۔ سوادِ شہر ۔ گھاٹ ۔ بحرِ سیہ ۔ رہگزر ۔ نازنیں آنکھیں ۔ مہک۔ نوحہ گر ۔ سُونے کھنڈر ۔ ریشمی سائے

شام کا سُورج خود اپنے ہی لہو کی دھاریوں میں ڈوب کر
دیکھتا ہے بجھتی آنکھوں سے سوادِ شہر کے سُونے کھنڈر

اس کو لے جائے گی پل بھر میں فنا کے گھاٹ پر
رات کے بحرِ سیہ کی موج ہے گرمِ سفر

دیکھتی آنکھوں اُفق کے سرد ساحل پر اندھیرا چھائے گا
ڈوبتا سُورج ابھی بھولے دنوں کی داستاں بن جائے گا

سرسراتے ریشمی سایوں سے بھر جائے گی ہر اِک رہگزر
نازنیں آنکھوں کی صورت ٹمٹمائیں گے خیالوں کے نگر

تیز سانسوں کی مہک اُڑتی پھرے گی رات بھر
تُو بھی خوش ہو، میرے دل! نوحہ گر شام و سحر!!

(جنگل میں دھنک)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) بقول شاعر شام کا سُورج کس طرح ڈوبتا ہے؟

ب) رات بھر تیز سانسوں کی مہک کیوں اُڑتی پھرے گی؟

ج) شاعر ''فنا کے گھاٹ'' سے کیا مُراد لیتے ہیں؟

د) نظم ''زندگی'' میں مختلف مرکبات کی نشاندہی کریں۔

۲۔ نظم کے متن کے مطابق دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نظم زندگی ہیت کے لحاظ سے ایک نظم ہے۔

i) نثری ii) آزاد

iii) معریٰ iv) پابند

ب) نظم زندگی تخلیق ہے۔

i) منیر نیازی کی ii) احمد فراز کی

iii) احمد ندیم قاسمی کی iv) مجید امجد کی

ج) منیر نیازی کا شمار شعرا میں ہوتا ہے۔

i) کلاسک ii) مزاحیہ وطنزیہ

iii) جدید iv) قصیدہ گو

د) نظم زندگی شاعر کی کتاب میں شامل ہے۔

i) جنگل میں دھنک ii) ماہ منیر

iii) بے وفا کا شہر iv) دشمنوں کے درمیان

۳۔ نظم کے مطابق درج ذیل خالی جگہیں درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) نازنیں آنکھوں کی صُورت ٹمٹائیں گے .... کے نگر (خیالوں، پریوں، سوچوں)

ب) اس کو لے جائے گی پل بھر میں .... کے گھاٹ پر (بقا، فنا، دریا)

ج) تیز سانسوں کی مہک اُڑتی پھرے گی .... بھر (دن، رات، سال)

د) تو بھی خوش، میرے ....! نوحہ گر شام و سحر (دل، آشنا، من)

ہ) دیکھتی آنکھوں اُفق کے سرد .... پر اندھیرا چھائے گا (ساحل، سمندر، دریا)

۴۔ نظم ''زندگی'' کی روشنی میں دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) نظم ''زندگی'' ایک مزاحیہ نظم ہے۔

ب) نظم ''زندگی'' کا بنیادی نکتہ عشق ہے۔

ج) نظم ''زندگی'' ایک تجریدی نظم ہے۔

د) نظم ''زندگی'' میں سُورج ڈوبنے کی منظر کشی کی گئی ہے۔

۵۔ نظم ''زندگی'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔ شاعر نے نظم ''زندگی'' میں جو تصور پیش کیا ہے اُسے اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۷۔ نظم ''زندگی'' کے آخری شعر کی تشریح کریں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے تکنیکی قواعد زبان کا ادراک کروائیں اور لسانی انتخابِ لفظی کے قواعد کی پہچان کروائیں۔

۲۔ کمرۂ جماعت میں منیر نیازی کی چند نظمیں اور سنوائی جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو منیر نیازی کی نظمیہ شاعری سے متعارف کروائیں۔

۲۔ اُردو نظم گوئی میں منیر نیازی کا مقام بتائیں۔

۳۔ منیر نیازی کے اسلوبِ سخن کے مختلف پہلوؤں پر لیکچر دیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا (بہ حیثیت شاعر)

(حالاتِ زندگی)

ڈاکٹر وزیر آغا زمانہ طالب علمی ہی سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے اور جلد ہی اُردو شاعری خصوصاً نظم میں ایک مخصوص مقام حاصل کیا۔ پرانے وقتوں میں شاعر اپنی قادر الکلامی کے اظہار کے لیے ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کی فطری مناسبت کسی ایک صنف ہی میں ہوتی تھی۔ کیوں کہ ایک شخص ہر فن مولا نہیں ہوسکتا تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اپنی قادر الکلامی کے اظہار کے لیے ہر صنف میں شاعری کی مگر مقبولیت صرف نظم ہی میں حاصل ہو سکی۔

ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ وہ اختصار اور جامعیت ہے۔ نظم میں اختصار اور بیان میں جامعیت محسوسات کو چھو کر نکل جاتے ہیں۔ بلکہ ذہن کو اس طرح متاثر کرتے ہیں۔ جیسے تیرِ نیم کش کسی کے دل میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں نفسیاتی مطالعہ، احساس کی شدت اور جذبات کا طوفان پیش کیا ہے جو پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔

ان کے کلام میں خوب صورت تشبیہات کے علاوہ الفاظ کی خوبصورت تراکیب بھی موجود ہیں اور ان تراکیب کو آغا نے نئے معنی عطا کیے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بعض موقعوں پر ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔

ان کی نظموں میں موسیقیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ موسیقیت پیدا کرنے کے لیے مترنم بحریں استعمال کرتے ہیں۔ الغرض ان کی نظموں میں دل کو بھانے والی جملہ کیفیات موجود ہیں۔ شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، یہ آواز کیا ہے اور چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل اُن کے شعری مجموعے ہیں۔

دھرتی کی آواز

(ڈاکٹر وزیر آغا)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری سے متعارف کروانا۔
۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے اندازِ سخن سے واقفیت دلانا۔
۳۔ طلبہ کو نظموں کی مختلف ہیئتیں بتانا۔
۴۔ اُردو نظمیہ شاعری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مقام بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب: دُھند ۔ اوجِ ثریا ۔ دھرتی ۔ برق ۔ خرمن ۔ کٹیا ۔ بھسم ۔ رِدا ۔ زر و سیم ۔ بار

بادلو! دُھند کی مانند بکھرنا سیکھو
یہ بھی کیا اوجِ ثریا پہ گرجتے رہنا
زخمی چیتے کی طرح خود پہ بگڑتے رہنا
یا تو آنا ہی نہ دھرتی کی عیادت کے لیے
اور اگر آنا تو اِک برق سی بن کر آنا
کسی نادار کے خرمن کو جلانے کے لیے
کسی مفلس کی ٹھٹھرتی ہوئی کٹیا کے قریب
اُس کے معصوم سے بچے کو بھسم کر جانا
بادلو! دُھند کی مانند بکھرنا سیکھو
اِک رِدا بن کے بکھر جاؤ مری دنیا پر
اپنے دامن میں چھپا لو میرے سب بچوں کو
یہ بلکتے ہوئے ہنستے ہوئے معصوم سے لوگ

جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زروسیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اِک دل کو بھی محسوس نہ ہو

ہم سفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زروسیم کی تقسیم کا یہ جُرم، فریب

میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے مُوجب
بادلو! آؤ اُتر آؤ مری دُنیا پر!

(شام اور سائے)

مشق

ا۔ درج ذیل کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر بادلوں سے کس طرح مخاطب ہے؟

ب) شاعر بادلوں کو کیا نصیحت کرتا ہے؟

ج) شاعر کا ''اوجِ ثریا'' سے کیا مراد ہے؟

د) نظم ''دھرتی کی آواز'' میں استعمال کیے گئے تشبیہات اور استعارات کی نشان دہی کریں۔

۲۔ نظم ''دھرتی کی آواز'' کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نظم ''دھرتی کی آواز'' میں شاعر نے بادل بطور استعمال کیا ہے۔

i) علامت ii) تشبیہ iii) استعارہ iv) کنایہ

ب) نظم ''دھرتی کی آواز'' شاعر کے مجموعے میں شامل ہے۔

i) دن کا زرد پہاڑ ii) شام اور سائے iii) یہ آواز کیا iv) مہک اٹھی لفظوں کی چھاگل

ج) نظم ''دھرتی کی آواز'' ایک نظم ہے۔

i) طنزیہ ii) تجریدی iii) علامتی iv) تلمیح

د) نظم ''دھرتی کی آواز'' ہیت میں لکھی گئی ہے۔

i) رباعی کی ii) مخمس کی iii) مسدس کی iv) مثنوی کی

ہ)　نظم ''دھرتی کی آواز'' تخلیق ہے۔

i)　احمد ندیم قاسمی کی　　ii)　میراں جی کی

iii)　جوش ملیح آبادی کی　　iv)　ڈاکٹر وزیر آغا کی

۳۔　نظم ''دھرتی کی آواز'' کے مطابق درج ذیل خالی جگہیں دُرست الفاظ سے پُر کریں۔

الف)　بادلو! دھند کی مانند .... سیکھو　　(بکھرنا، اُڑنا، بچھڑنا)

ب)　یا تو آنا ہی نہ دھرتی کی .... کے لیے　　(سعادت، عبادت، عیادت)

ج)　یہ بلکتے ہوئے .... ہوئے معصوم سے لوگ　　(روتے، ہنستے، سسکتے)

د)　کسی .... کے خرمن کو جلانے کے لیے　　(نادار، امیر، غریب)

ہ)　زخمی .... کی طرح خود پہ بگڑتے رہنا　　(چیتے، شیر، شیرنی)

۴۔　نظم ''دھرتی کی آواز'' کے مطابق دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف)　''دھرتی کی آواز'' ایک آزاد نظم ہے۔

ب)　''دھرتی کی آواز'' میں بادل بطور علامت استعمال ہوئے ہیں۔

ج)　''دھرتی کی آواز'' کا محور بچہ ہے۔

۵۔　نظم کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۶۔　نظم میں شاعر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے آپ کس طرح اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟

۷۔　نظم کے پہلے چار اشعار کی تشریح کریں۔

سرگرمیاں

۱۔　اساتذہ کرام طلبہ سے ادارے کے رسالے/مطبوعات یا ویب سائٹ میں سے کچھ لکھوائیں۔

۲۔　اساتذہ کرام طلبہ میں نصابی کتب کے علاوہ دیگر ادبی و علمی کتب کے مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے لائبریری سے کتب کا انتخاب کروائیں۔

۳۔　کمرۂ جماعت میں ڈاکٹر وزیر آغا کی چند اور نظمیں بھی سنوائی جائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔　طلبہ کو ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری سے متعارف کروائیں۔　　۲۔　ڈاکٹر وزیر آغا کا اندازِ سخن بتائیں۔

۳۔　اُردو نظمیہ شاعری میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مقام پر لیکچر دیں۔

فرہنگ

حصہ نثر

بنتِ بہادر شاہ

الفاظ	معانی
آبرو	عزت، حرمت
اُجلے	صاف ستھرے
آیا	نوکرانی، خادمہ، ماسی
اوجھل	چھپ جانا، غائب ہونا
ایکا یکی	اچانک، یک دم
بپتا	کہانی، روداد
بریانی	گوشت اور مصالحے دار چاول
برہنہ سر	ننگے سر
بنت	بیٹی، دختر
بے کس	بے چارا، بے آسرا، بے یار و مددگار
بے حجابانہ	بغیر پردے کے
پیٹھ	پچھواڑے، پیچھے
پرال	سوکھی گھاس پھونس
پاپی	گنہگار
رتھ	بگھی کی قسم
رتھ بان	کوچوان
درشن	دیکھنا، ملاقات، دیدار کرنا
مگس رانی	مکھیاں اُڑانا
ناگہانی	اچانک
ناؤ	کشتی

ریل کا سفر

الفاظ	معانی
اقامت پذیر	قیام پذیر
بادی النظر	سرسری نظر سے/ ابتدائی نظر میں
بوالعجمیوں	عجیب و غریب حرکتیں

الفاظ	معانی
بھنور	پانی کا گول چکر/ گرداب
جبلت	عادت، فطرت
بھاری بھرکم	موٹے جسم والا
بھانت بھانت کا	طرح طرح کا/ قسم قسم کا
جاذب نظر	پرکشش اور اپنی طرف کھینچنے والی نظر
جسمانی آسائش	جسمانی آرام
خرابیِ بسیار	بہت زیادہ تباہی و بربادی
دِلربائی	دلبری، معشوقی
دِلنواز	دوست، دل کو تسلی دینے والی چیز
سعادت	خوش نصیبی، نیک بختی
شفٹنگ	منتقلی، مقام بدلنا
شکوک و شبہات	شک و شبہ کی جمع، ابہام
فراموش	بھلا دینا، بھول جانا
قطع نظر	بہر صورت، اس کے سوا، اس سے ہٹ کر
گڈمڈ	ملا جلا، ملا دینا، خلط ملط
گہما گہمی	رونق، آدمیوں کی کثرت
گڈریا	بھیڑ بکریاں چرانے والا
ہچکولے	جھٹکے، جنبش

زمانہ قدیم میں ہندوستانی کے طور طریقے

الفاظ	معانی
اشراف	عزت دار لوگ، طبقہ اعلیٰ
انبوہ	ہجوم، بھیڑ
انجیر	ایک قسم کا پیڑ جس کے گول پھل کھانے میں میٹھا ہوتا ہے
بھجن گانا	وہ گانا، گیت جس میں ہندو بھگوان کی تعریف کرتے ہیں

الفاظ	معانی
بھسم	خاک، راکھ، جل جانا
پنتھ	فرقہ، قوم، گروہ
پورب	مشرق/گنگا کے مشرق میں واقع علاقہ
ٹکشلا	ٹیکسلا (علاقے کا نام)
تپسیا	سخت ریاضت/عبادت
جاں نثار	جان قربان کرنے والے
چتا	لکڑیوں کا ڈھیر جس پر ہندو مردے کو رکھ کر جلاتے ہیں
چیلے	مرید، غلام، شاگرد
خوش رنگ پتھر	خوبصورت رنگ کا پتھر
دان پان	صدقہ وخیرات
ستی ہونا	ہندوؤں میں مردہ شوہر کے ساتھ عورت کے جل مرنے کی رسم
لیپ	لپائی، پلستر

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

الفاظ	معانی
اسماء الرجال	لوگوں کے نام
املا	زبانی لیکچر، لکھنے کا طریقہ
امالی	لیکچرز کا مجموعہ/ املا سے متعلق
اجتہاد	نئی راہ نکالنا بمطابق شریعت
اہل منصب	بڑے عہدوں والے
تصنیف	کتاب
تالیف	مختلف مضامین جمع کر کے کتاب مرتب کرنا
تذکرے	بیان، یادداشت، سوانح عمری، وہ کتابیں جس میں شاعروں اور نثر نگاروں کا حال لکھا جائے
حجرے	کمرے
خانقاہوں	درویشوں کی رہائش گاہ، جہاں علم طریقت سے آگاہی دی جاتی ہے

الفاظ	معانی
سلف	پرانے بزرگ، آباؤ اجداد
محقق	تحقیق کرنے والا، کھوج لگانا
رصد خانہ	تجربہ گاہ، مشاہدہ گاہ
زمرے	دائرے
طیلساں	لمبا چوغہ، عالمانہ لباس، گاؤن
غارت گری	تباہی
فیاضیاں	سخاوتیں
مناظرہ	کسی موضوع پر آمنے سامنے بحث کرنا
ہنوز	ابھی تک

اُردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ

الفاظ	معانی
ادب القدما	قدیم ادب
اقلیم	ملک
استحقاق	حق طلب کرنا
عناصر خمسہ	پانچ رکن۔ مراد اُردو ادب کے پانچ نامور شخصیات: سرسید، حالی، نذیر احمد، شبلی، محمد حسین آزاد
اکبری نورتن	شہنشاہ اکبر کے نو صاحب کمال وزیر
برجستہ	بے ساختہ، بے تکلف
تلافی	ازالہ
تغیر پذیر	تبدیل ہونے والی چیز/ شے
تنقیدات عالیہ	گہری جانچ پڑتال
دسترس	قابلیت۔قدرت۔طاقت
سکہ جمانا	رعب قائم کرنا
سخن آفرینی	شاعری، نثر نگاری
منحرف	غدار۔باغی۔ٹیڑھا
مجتہد	صحیح راستہ نکالنے والا
مرعوب ہونا	رعب اور دباؤ میں آنا
معقولات	معقول کی جمع۔علومِ حکمت وفلسفہ

الفاظ	معانی
وصفِ اضافی	زائد خوبی

کہنے کی باتیں

الفاظ	معانی
اربابِ نشاط	ناچنے گانے والے، عیاش لوگ
بنچ تھپتھپانا	بنچ / میز بجانا
تحت اللفظ	ترنم کے بغیر شعر پڑھنا
تحسین و مرحبا	آفرین، شاباش
چونی	چار آنے
رومانی نظم	عشقیہ نظم
زیبِ تن	پہنا ہوا
سخنوری	شاعری
سیاہ ماتمی لباس	کالا لباس جو غم کے موقع پر پہنا جاتا ہے
ضمیمہ	کمی بیشی کے بعد کی تحریر
طبائی	طبیعت
طرحی غزل	وہ غزل جو مقررہ طرح پر کہی جائے
محفلِ سماع	قوالی کی محفل
کھچا کھچ	بھرا ہوا
متمول	دولتمند، مالدار
مہتمم	انتظام کرنے والا، سربراہ
معاً	اچانک
نومشق	نیا سیکھنے والا
ہجوم زار	بڑا ہجوم، مجمع

سفارش

الفاظ	معانی
احمق	بے وقوف
اعتراف	مان لینا
برآنڈے	برآمدے
بھول پن	معصومیت
بینائی	آنکھ کی روشنی

الفاظ	معانی
بھورا	ذرا
پٹس	مصیبت/ بچھ جانا
تشویش	فکر
تیور	انداز
جتن	کوشش
رمق	آخری سانس
زنن	تیزی سے
گھتم گتھا	ایک دوسرے میں مل جانا، جھگڑنا
گل ہو گئے	خرچ ہو گئے
غضب ہو گیا	مصیبت آ گئی
محروم	خالی
ممنونیت	احسان مندی
ندامت	شرمندگی

جی آیا صاحب

الفاظ	معانی
انبار	ڈھیر
برچھی	نیزہ
جنبش	حرکت
چراغِ گور	قبر کی روشنی
حیات	زندگی
دھندلی	مدھم
حسرت	ارمان
خون آشام	خونخوار
خاکستری	مٹی جیسا
خون کی دھار	بہتے خون کی لکیر
خفگی	ناراضگی
خراش	زخم کی ہلکی لکیر۔ رگڑ
دھبہ	نشان

الفاظ	معانی
ظلمت	اندھیرا
قرینہ	ڈھنگ۔ طرز۔ سلیقہ
قمقمہ	چھوٹی قندیل۔ بلب
کیتلی	چینک جس میں چائے بنائی جاتی ہے
لرزنا	کانپنا
مغلوب ہونا	عاجز ہو جانا

کتبہ

اثاثہ	کل جائیداد۔ کل جمع پونجی
ابخرات	بخارات
آلاتِ جراحی	ڈاکٹری کے آلات، جراحی کے اوزار
جویا ہونا	طلب گار ہونا
چابک دستی	ہوشیاری۔ کاریگری، مہارت سے، یک دم
حرص	لالچ۔ خواہش، طمع
رنگروٹ	زیرِ تربیت
خم	ٹیڑھاپن
ساجھے	مشترکہ
غل غپاڑہ	شور، ہنگامہ
کفایت شعاری	بچت کرنا
کنگلا	نہایت غریب
گتھیاں سلجھانا	مسئلہ حل کرنا
گھرستی	گھریلو
گھاگ	پرانا۔ تجربہ کار
منجھلی	درمیانی

چور

آسودگی میسر نہ ہونا	خوشحالی میسر نہ ہونا
آنکھیں ڈبڈبانا	آبدیدہ ہونا، رونی صورت
السی کے تیل	ایک پودہ جس کے بیج سے تیل نکالا جاتا ہے

الفاظ	معانی
پستہ قد	چھوٹے قد والا
تیوری چڑھانا	ماتھے پر شکن پڑنا، ناگوار ہونا
تلے والی	سینے پرونے کا سامان وغیرہ رکھنے کی چھوٹی تھیلی
ٹرانسسٹر	سیل سے چلنے والا ریڈیو
دھاڑیں مار مار کر رونا	زور زور سے رونا، بین کرنا
زور کا دھپا	زور کا تھپڑ
سقہ	ماشکی، پانی پلانے والا
کنپٹی	کان کے اوپر کا حصہ
قوتِ مدافعت	روکنے کی طاقت
کنگن	کلائی کا زیور
کانچ کی چوڑی	شیشے کی چوڑی
لنڈا	وہ بازار جہاں استعمال شدہ اشیا فروخت ہوتی ہیں
مسرور	خوش
ہو کا عالم	سنسان، سناٹا، حد درجہ خاموشی

شریف آدمی

انگڑائی لینا	سستی نکالنے کے لئے دونوں ہاتھوں کا کھینچنا
برتن مانجھنا	برتن صاف کرنا
تاڑ	فراست/کھجور کی ایک قسم
تاؤ آنا	غصے میں آنا
جھجک محسوس کرنا	شرم محسوس کرنا، ہچکچاہٹ
حقیر	معمولی، گھٹیا
ٹبر	خاندان، گھر کے تمام لوگ
دن کٹنا	دن گزر جانا
ڈھاک کے تین پات	اپنی بات پر اڑے رہنا، ہمیشہ ایک حال میں رہنا۔ وہی پرانی حالت۔
رکابی	پلیٹ
علیل	بیمار

الفاظ	معانی
گوراچٹا	خوبصورت، سفید رنگ والا
لقمہ دینا	دوسرے کی بات میں بولنا، مدد کرنا
مضمحل	کمزور، رنجیدہ، اُداس، ناتواں
منہ بسورنا	رونے کی صورت بنانا
وضع قطع	حلیہ، شکل وصورت، ظاہر حالت
ہنگامہ	فساد، گڑبڑ
ہکابکا رہنا	حیران ہونا، دنگ رہ جانا

نیا گوتم

ازلی	ہمیشہ، دائمی، ابتدائے آفرینش سے
انکشاف	پوشیدہ بات ظاہر ہونا
برگد	بڑ کا درخت، ایک درخت کا نام
بطن	پیٹ، کسی چیز کا اندرونی حصہ
پیمان	وعدہ، عہد
تبسم	مسکراہٹ، ایسی ہنسی جس میں ہونٹ نہ کھلیں
حدِ فاصل	جو دو چیزوں کے درمیان آکر ایک دوسرے سے جدا کرے
زمانِ حیات	ہر زمان پر، زندگی کے دوران میں
عشرت قطرہ	معمولی خوشی
قطع زمین	زمین کا ٹکڑا
کھوج	سراغ
کمیاب	وہ چیز جو کم پائی جائے، نایاب
کوکھ	پیٹ بطن
گیاہ	گھاس
منقش	نقش ونگار والا
نمو	افزائش
نمود	ظاہر ہونا

الفاظ	معانی
وحدت الوجود	صوفیوں کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ ہی کو ایک وجود ماننا

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

آویزاں کرنا	لٹکانا
اولوالعزمی	بلند ہمتی
الحاد	دینِ حق سے پھر جانا
ایشور	بھگوان، اللہ تعالیٰ
بر سبیل تذکرہ	ذکر کے طور پر
تقطیع	تحریر کو ٹکڑے کر کے سمجھنا
جوش شباب	جوانی کا جوش
جل ترنگ	چینی کی پیالیوں میں پانی بھر کر اسے تیلیوں سے بجاتے ہیں
خوابیدہ	سویا ہوا، نیند میں بھرا ہوا، غافل
روح افزائیاں	روح کو سکون بخشنے والی
سورج گرہن	چاند کا سورج اور زمین کے درمیان میں آکر سورج کی روشنی زمین تک نہ پہنچنے دینا
سحر خیز	صبح سویرے اٹھنے والا
طمانیت	اطمینان
عدم تشدد	تشدد یا ظلم نہ کرنا
عالم خواب	نیند کی حالت
لٹھ	ڈنڈا
لغو	فضول
مرعوب ہونا	رُعب میں آنا
کروٹ بدلنا	پہلو بدلنا

سنہ

اڈھیڑ بن	سوچ بچار
بہکی بہکی باتیں کرنا	بے سروپا باتیں کرنا

الفاظ	معانی
بن مانس	انسانی صورت سے مشابہ بندر
بہ یک گردش چرخ	آسمان ایک ہی گردش/ چکر میں
بھولے بھالے	معصوم، بے گناہ
دُعائے مغفرت	بخشش کے لئے دعا
راز فاش ہونا	راز ظاہر ہونا
رُت	موسم
روہیل	آگرہ اور اودھ کے شمالی علاقے روہیل کھنڈ پر قابض پٹھان قبیلے روہیل کے حکمران
رموز نکات	پوشیدہ نکات
سبزہ اوس	سبزے پر شبنم کے قطرے
سلونا موسم	خوبصورت موسم
قبل از مسیح	حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے
گھمبیر لہجہ	بھاری/ بوجھل لہجہ
مشاہیرِ عالم	دنیا کے مشہور لوگ
مؤرخین	تاریخ لکھنے والے
موجۂ گل	پسندیدہ پھل
مصلحت	باہمی صلح
یادش بخیر	دعائیہ کلمہ/ اس کی یاد خیر سے

آغا حشر

الفاظ	معانی
آڑے آنا	کام آنا، رکاوٹ بننا
اذکار	ذکر، تذکرہ
انشا پرداز	نثر لکھنے والا
اُفتاد	مصیبت
پھبتیاں	چوٹ کرنا، مذاق اُڑانا
بھیانک	خوفناک
بذلہ سنج	لطیفہ گو
بانکا پھکیت	انوکھا ماہر

الفاظ	معانی
پنبہ دان	منہ میں روئی یعنی گونگا
چومکھی	چاروں طرف لڑنا
چاروں شانے چت	کمر کے بل گرنا
ڈھاڑی	نقلیں اُتارنے والے
ڈوم	مراثی
ذرہ نوازی	ذرے کو عزت دینا
سینت	سنبھالنا
سینہ تان کر	ڈٹ کر
طاق	ماہر
مشاق	ماہر
علائق	سامان وغیرہ
ملائے مکتبی	اُستاد، مکتب میں پڑھانے والا استاد
ہیچ مدان	کچھ نہ جاننے والے جاہل

ایک وصیت کی تعمیل

الفاظ	معانی
جھرجھرا	بہت باریک
اڑواڑ	وہ لکڑی جس سے کمزور چھت کو سہارا دیا جاتا ہے تاکہ گر نہ پڑے
اطلس	ایک ریشمی چمکدار کپڑا
بایدوشاید	کبھی کبھار
چاندنیاں	سفید چادریں جو فرش پر بچھائی جاتی ہیں
چرنے چگنے	کھانے پینے
چوبا چکٹ	سخت میلے اور چکنے
خداداد	اللہ کی عطا کی ہوئی
زود فہمی	بات کو جلد سمجھنے کی صلاحیت
ڈگ	قدم
ڈھنڈار	بڑا اور ویران مکان
طبقات شعرائے ہند	اُردو کے شاعروں کے تذکرے پر مشتمل ایک کتاب کا نام

الفاظ	معانی
طبع ساز	دور تک بات سمجھنے اور سوچنے کی حقیقت
زمزمہ سنجی	گانا، چہچہانا
کنج قفس	پنجرے کا کونہ
کھری	کوئی کپڑا بچھائے بغیر
صراحت	وضاحت
مٹھی بند ہوئی	کنجوس ہو گیا
منڈوا	عارضی طور پر سایہ دار جگہ بنا لینا
یورش	حملہ

تیسری قسم کا بچہ

الفاظ	معانی
پبلک ریلیشن	تعلقات عامہ/عوام سے تعلقات
تقاضا	مطالبہ
تضاد	فرق
جوہر	خوبی، کمال
درس و تدریس	پڑھنا پڑھانا
دسترس	پہنچ، رسائی
روگ	بیماری، دکھ
روایت	کسی بات کی نقل کرنا
سفاک	ظالم
سیماب	پارہ
سعادت مند	فرماں بردار
طفولیت	بچپنا
قصہ خوانی	پشاور کا ایک مشہور بازار
قناعت	صبر
مرغوب	پسندیدہ
مجسمہ	دھات سے بنا جسم
ناقابلِ فہم	سمجھ میں نہ آنے والی بات
ہابی	مشغلہ

الفاظ	معانی
ہرفن مولا	ہر کام/فن جاننے والا

غزل (علامہ اقبال)

الفاظ	معانی
اندیشہ	فکر
برہمن	ہندوؤں میں سب سے اونچی ذات
تحقیر	بے قدری، توہین
خانقاہ	درویشوں اور مشائخ کی رہنے کی جگہ
دل کی موت	روحانی موت
رموزِ قلندری	درویشی کے راز
رشی	ہندو عبادت گزار، جو دنیا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں میں رہتے ہیں
رعنائی	رنگینی، خوشنمائی
رموز	رمز کی جمع مراد راز یا بھید، اشارے
سوئے کوفہ	کوفہ کی جانب
طلسم	جادو
عصائے کلیمی	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ڈنڈا
فاش کرنا	ظاہر کرنا
فلسفی	علوم عقلی کا ماہر
فقیہہ	اسلامی قوانین کے علم کا ماہر
فساد	فتنہ، جھگڑا
کشاد	وسعت
کوفہ و بغداد	دنیائے عرب کے دو مشہور شہر جو مسلمانوں کے علمی و تہذیبی شہر تھے
کلیمی	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے کی صفت
کارِ بے بنیاد	بے فائدہ کام
مے خانہ فرنگ	یورپ کا شراب خانہ مراد یورپی تہذیب
مجال	ہمت
مُلا	مذہبی راہنما، عالم

غزل (فیض احمد فیض)

الفاظ	معانی
آہِ سحر	صبح کے وقت دل سے نکلنے والی آہ یا دعا
آشنا	واقف
ابر بہار	بہار کے موسم میں برسنے والے بادل
ادا	انداز
بادِ صبا	صبح کی ٹھنڈی ہوا
بادِباں	وہ کپڑا جو کشتی کی رفتار تیز کرنے اور اس کا رُخ موڑنے کے لئے لگایا جاتا ہے
بتوں	یہاں مراد حسین لوگ/محبوب
تہہ کرلو	بند کرلو
خارِ گلو	گلے کے کانٹے، حلق میں چبھنے والے کانٹے
دستِ دُعا	دُعا کے لیے اُٹھنے والا ہاتھ
روزِ جزا	حساب کتاب کا دن یعنی قیامت کا دن
روش	رویہ، عادت
رنگِ فصلِ بہار	بہار کے موسم کی خوبصورتی
صدق وصفا	سچائی اور پاکیزگی
لہو	خون آلود
مضطرب	پریشان یہاں مراد مخالف ہوا
نشاط	خوشی
نفس	سانس
وسوسے	شک وشبہ
وقار	قدر ومنزلت

غزل (ناصر کاظمی)

الفاظ	معانی
اس حویلی	مراد محبوب کا گھر
جی	دل
خانۂ دل	دل میں
خامشی	خاموشی
شور برپا	شور اُٹھا ہے
شریکِ سخن	شریک گفتگو
کھڑکی کھلی	مراد محبوب کے کمرے کی کھڑکی ابھی کھلی ہوئی ہے
لہر	جوش

غزل (احمد فراز)

الفاظ	معانی
اُسی کافر	اُسی محبوب کے عشق میں مبتلا ہوگئے
بچھڑ	الگ ہوکر
چارہ گر	علاج کرنے والا
در	دروازہ
دردِ ہجر	جدائی کی تکلیف
رفتہ رفتہ	آہستہ آہستہ
کوئے ستم گر	ظالم محبوب کی گلی
مقدر	قسمت
محو	مصروف
ناصحانِ شہر	شہر کے نصیحت کرنے والے لوگ
یادِ یار	محبوب کی یاد

غزل (احمد ندیم قاسمی)

الفاظ	معانی
اسیرِ زندگی	زندگی کا قیدی یعنی دنیاوی زندگی میں قید
اکیلے پن	تنہائی
امکان	ممکن، نہیں، نہیں ہوسکتا
بسیط	کشادہ، وسیع
پارسائی	نیکی، پرہیزگاری
چرچا	شہرت، مشہوری
خودنمائی	اپنے آپ کو ظاہر کرنا
رسائی	پہنچ، دسترس
رہائی	یہاں مراد دنیاوی زندگی سے رہا ہوکر موت یعنی آخرت کی طرف جانا

الفاظ	معانی
شہرہ	شہرت/مشہوری، چرچا
کبریائی	بڑائی، عظمت، جلال
مبہوت	حیران ہونا، ہکابکا رہ جانا

غزل (شہزاد احمد)

الفاظ	معانی
بل پڑنا	ماتھے پر شکن پڑنا
جبیں	پیشانی، ماتھا
خلل پڑنا	رکاوٹ
رُت	موسم
ضبط	برداشت
طبع	طبیعت، خصلت
کسک	ٹیس، ہلکا ہلکا سا درد
مردہ محبتیں	سوئی ہوئی محبت، خوابیدہ محبت
ماہتاب	چاند
یارا	حوصلہ، طاقت، ہمت

غزل (ظفر اقبال)

الفاظ	معانی
آبِ رواں	بہتا ہوا پانی
خوابِ خاک	بے مقصد خواب
دام	جال
ڈسنا	کاٹنا
سرسرانا	ہوا کا سائیں سائیں کی آواز سے چلنا
عکسِ در و بام	دروازے اور چھت کا سایہ
زاویے	دو خطوط کا آپس میں ملنے کا مقام، کونہ/گوشہ
فلک	آسمان
لرزنا	کانپنا
نیام	تلوار، خنجر وغیرہ کا میان

غزل (شکیب جلالی)

الفاظ	معانی
پسِ دیوار	دیوار کے پیچھے

الفاظ	معانی
پتوار	کشتی کا رُخ موڑنے کی لکڑی
پرستار	چاہنے والا
پیڑ	درخت
تجلی	نور، روشنی
دستار	پگڑی
دلدل	کیچڑ
در و بام	دروازہ اور چھت
دہشت	خوف

نظم: فاطمہ بنتِ عبداللہ

الفاظ	معانی
آبرو	عزت
امتِ مرحوم	وہ اُمت تباہ حال ہے مراد ملت اسلامیہ
آہو	ہرن
آغوش	گود
اندازِ کہن	پرانا انداز، طریقہ
پوشیدہ	چھپا ہوا
پرتو	روشنی، عکس
تابانی	چمک دمک، روشنی
تربتِ خاموش	خاموش قبر/جس پر خاموشی طاری ہے
جسارت آفریں	بہادری پیدا کرنے والا ہمت دلانے والا
حورِ صحرائی	ریگستان میں رہنے والی خوبصورت اور پاک باز لڑکی
خاکستر	راکھ، بجھی ہوئی آگ
خوابیدہ	سوئی ہوئی
دیدۂ انسان	انسان کی آنکھ
ظہور	ظاہر ہونا
نالہ ماتم	کسی کے مرنے پر رونا، فریاد کرنا

نظم: او دیس سے آنے والے بتا!

الفاظ	معانی
آوارۂ غربت	وطن سے دور مسافر

الفاظ	معانی
للہ	اللہ کے واسطے
احباب	دوست
برکھائیں	برساتیں یعنی برسات
پربت	پہاڑ
پیڑ	درخت
چاہ	محبت
ریحانِ وطن	وطن کے خوشبودار پھول، نیاز بو
سرمست	مستی میں ڈوبے ہوئے
سرو	دراز قد درخت
دلوں کو بھاتی ہیں	دلوں کو اچھا لگتی ہیں
شاداب	سرسبز
فردوسِ وطن	وطن جو جنت نظیر ہے، وطن کے باغات
کس رنگ	کس حال
کنعاں وطن	ملک شام کے ایک شہر کا نام جو حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کا وطن ہے
کنارِ دریا	دریا کے کنارے
گھنگھور گھٹائیں	سیاہ گھنے بادل
گھنیرے	گھنے
مہتاب	چاند
مستانہ ہوائیں	مست اور مخمور کردینے والی ہوائیں

نظم: وحدتِ انسانی

بنیاد	جڑ، اصل
بت	مورتی، پتلا، صنم
پائے مال	برباد، روندا ہوا، کچلا ہوا
تیرگی فشاں	تاریکی پھیلانے والا
خوبانِ بوستاں	باغ کے حسین محبوب مراد کھلے ہوئے خوبصورت پھول اور پرندے

الفاظ	معانی
حُسنِ اللہ داد	اللہ کی عطا کی ہوئی خوبصورتی
دوکان	جہاں چیزیں/ مال بکتا ہے
روشنی چکاں	روشنی پھیلانے والے
رغبت	توجہ، لگاؤ
رگ	جسم کی نالی جس میں خون بہتا ہے
رحمتِ عمیم	اللہ تعالیٰ کی خصوصی اور عام رحمت ومہربانی
راہ رو	راستے پر چلنے والا
زبانیں جدا جدا	مراد سب اپنے اپنے انداز اور طریقے سے اللہ کی عبادت و پرستش کرتے ہیں
زرد پھول	وہ پھول جو مرجھا کر سوکھ کر زرد پڑ جائیں
سروں پر دھول	سر پر مٹی مراد ذلیل کرنا
مال	سودا، جنس
شمول	شامل
علتِ ایجاد	بنانے کی وجہ
مرغزار	سبزہ زار
نسیمِ بہار	بہار کے موسم کی ٹھنڈی ہوا
نزول	اُترنا
وحدتِ انسانی	اکائی، انسانوں کا ایک ہونا
یارِ مہرباں	مہرباں اور مخلص دوست

نظم: دکھ کی کروٹ

آکاش	آسمان
اُجلے	صاف ستھرے
بھید	راز
بھانپ گئی	پہچان گئی
دھرتی	زمین
ڈالی	ٹہنی، شاخ
درشن	دیدار

الفاظ	معانی
روپ	شکل، چہرہ
رجھانے	خوش کرنا، لبھانا
سپنے	خواب
گیسو	زُلف، سر کے بال
نورانی	روشنی کی طرح چمکتا ہوا، روشن، منور
مورت	صورت، شکل، بت

نظم: طلوعِ فرض

الفاظ	معانی
افتادگی	گر پڑنا
بھنورا	پھولوں کا رس چوسنے والا کیڑا
بچشمِ تر	روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مراد غم سہہ کر
پنچھی	پرندہ
پیاپے	مسلسل، ہر قدم پر
جوہڑ	گندے پانی کا تالاب
دانے دُنکے	معمولی خوراک
کسیلا	کڑوا، بدمزہ
کاسہ	کشکول، بھیک مانگنے کا پیالہ
گلوئے شور انگیز	شور مچاتا ہوا حلق
فراٹے سے	تیزی سے
متاعِ زیست	زندگی کا سامان
مَسل	فائل، کسی مقدمے کی کاروئی کے کاغذات جو ایک جگہ منسلک ہوں
ہمراہ صد کارواں	سینکڑوں قافلوں کے ساتھ، تمام مخلوقات کے ساتھ

نظم: پہلی کرن

الفاظ	معانی
آلۂ کار	ذریعہ، وسیلہ
آسودہ کوشی	خوشحالی برداشت کرنا
اُمید افزا	اچھے مستقبل کی اُمید
اُستواری	استحکام، پائیداری

الفاظ	معانی
بے محابا	بے دھڑک، بلا تامل
بے دست و پا	مجبور و بے بس
پاداش	بدلے میں، عوض میں
تزئین	آراستہ کرنا
تیرہ	کالا، سیاہ
جوئے شیر	دودھ کی ندی
چھپکلی	ایک رینگنے والا جانور جو اکثر دیواروں پر رہتا ہے
خشت کوبی	اینٹ کا کوٹنا
زمان و مکاں	وقت اور جگہ
شاد	خوش
شادیانے	خوشی کے باجے
شہنائی	باجہ/ بانسری
عبث	فضول، بے کار
مومیائی	ایک دوا جو زخم کے لئے مفید ہے
نانِ شبینہ	روزی
ہستیِ رائیگاں	عبث و فضول زندگی، بے کار زندگی

نظم: زندگی

الفاظ	معانی
اُفق	جہاں زمین و آسمان ملتے نظر آتے ہیں
بحرِ سیہ	تاریک سمندر
ٹمٹمائیں	چراغ بجھنے کا وقت
رہگزر	راستہ
فنا کے گھاٹ	موت
سُونے	ویران
سوادِ شہر	شہر کے اطراف
لہو کی دھاریوں	خون کی لکیریں
موج	لہر
مہک	خوشبو

الفاظ	معانی
نگر	شہر، قصبہ
نازنین	دل ربا، دل فریب
نوحہ گر	ماتم کرنے والا

نظم: دھرتی کی آواز

الفاظ	معانی
اوجِ ثریا	بلند آسمان پر سات ستاروں کا جھمکا
برق	بجلی
بھسم	جلانا
خرمن	گندم کا ڈھیر
بار	بوجھ
دھندلا	مدھم روشنی
دھرتی	زمین
ردا	چادر
زر و سیم	سونا اور چاندی
عیادت	یہاں مراد زمین کی حالت دریافت کرنے کے لیے
کٹیا	جھونپڑی
گرجنا	بجلی کا آواز دینا، بجلی کڑکنے کی آواز
موجب	سبب، وجہ
نادار	مفلس

جن کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں، زروسیم کا بار
یوں بکھر جاؤ کہ اِک دل کو بھی محسوس نہ ہو

ہم سفر کتنے کھلونوں کا بنا ہے مالک
کہ زروسیم کی تقسیم کا یہ جُرم، فریب

میرے بچوں کی ہلاکت کا بنا ہے مُوجب
بادلو! آؤ اُتر آؤ مری دُنیا پر!

(شام اور سائے)

مشق

۱۔ درج ذیل کے مختصر جواب دیں۔

الف) شاعر بادلوں سے کس طرح مخاطب ہے؟

ب) شاعر بادلوں کو کیا نصیحت کرتا ہے؟

ج) شاعر کا ''اوجِ ثریا'' سے کیا مراد ہے؟

د) نظم ''دھرتی کی آواز'' میں استعمال کیے گئے تشبیہات اور استعارات کی نشان دہی کریں۔

۲۔ نظم ''دھرتی کی آواز'' کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) نظم ''دھرتی کی آواز'' میں شاعر نے بادل بطور استعمال کیا ہے۔

i) علامت ii) تشبیہ iii) استعارہ iv) کنایہ

ب) نظم ''دھرتی کی آواز'' شاعر کے مجموعے میں شامل ہے۔

i) دن کا زرد پہاڑ ii) شام اور سائے iii) یہ آواز کیا iv) مہک اٹھی لفظوں کی چھاگل

ج) نظم ''دھرتی کی آواز'' ایک نظم ہے۔

i) طنزیہ ii) تجریدی iii) علامتی iv) تلمیح

د) نظم ''دھرتی کی آواز'' ہیت میں لکھی گئی ہے۔

i) رباعی کی ii) مخمس کی iii) مسدس کی iv) مثنوی کی

- بڑوں کا ادب کرنا اچھی عادت ہے۔
- نیک بنو نیکی پھیلاؤ۔
- والدین کا احترام کرنا چاہیے۔
- سچ بولنا اچھی عادت ہے۔
- چوری کرنا گناہ ہے۔
- صبح سویرے اُٹھنا اچھی عادت ہے۔
- علم کی روشنی پھیلاؤ۔
- جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔
- اساتذہ کا احترام کرنا چاہیے۔
- صفائی نصف ایمان ہے۔

قومی احتساب بیورو بلوچستان

جملہ حقوق بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ محفوظ ہیں

منظور کردہ صوبائی محکمہ تعلیم حکومت بلوچستان کوئٹہ۔ بمطابق قومی نصاب 2006ء اور نیشنل ٹیکسٹ اینڈ لرننگ پالیسی 2007ء ڈائریکٹر بیورو آف کریکلم اینڈ ایکسٹینشن سینٹر بلوچستان کوئٹہ بحوالہ مراسلہ نمبر CB/43-441 مورخہ 08 اکتوبر 2018ء۔ بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ اور ناشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی امدادی کتاب یا گائیڈ وغیرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

قومی ترانہ

پاک سَرزمین شاد باد کِشورِ حَسین شاد باد
تُو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سَرزمین کا نِظام قُوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم، مُلک، سَلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ سِتارہ و ہِلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ اِستقبال
سایۂ خدائے ذُوالجلال

NBD BOOK HOUSE
30123
BTB URDU (LAZMI) 12TH 2021 NBD

کوڈ نمبر U-XII/459(NP-2007)2019

سیریل نمبر

سال اشاعت	ایڈیشن	تعداد	قیمت
2021	اول	9000	138/-